ل کا ادبی و تہذیبی ورثہ

انیس چشتی

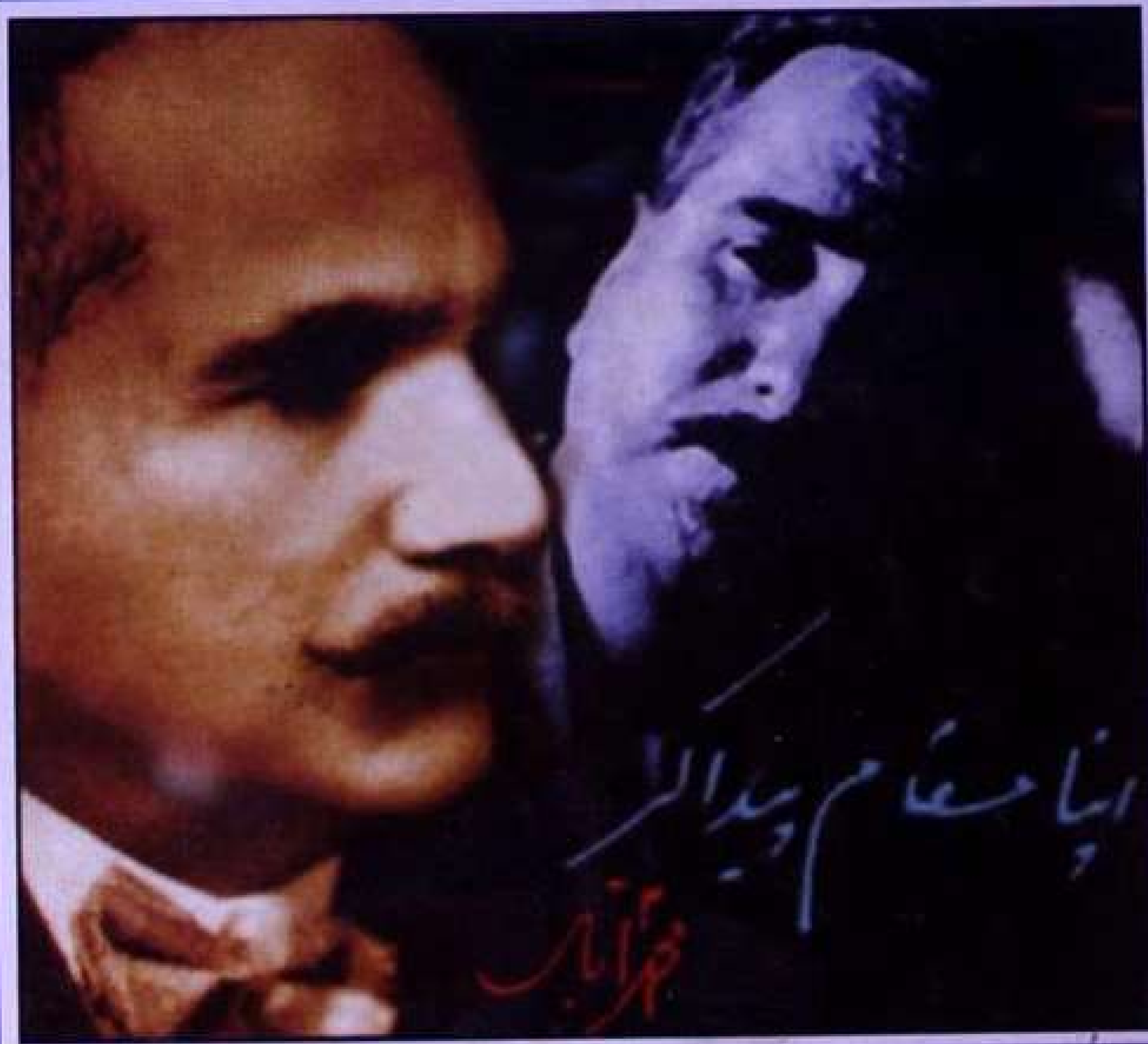

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

اقبال کا ادبی و تہذیبی وَرثہ

(عصرِ حاضر کے تناظر میں)

انیس چشتی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

IQBAL KA ADABI-WA

TEHZIBI WARSA

by

Anees Chishti

116,Sterling House,1984 Convent Street,
PUNE- 411001(INDIA) Ph: 020-26353450

Year of Ist Edition 2008

ISBN 81-81-8223-357-7

Price Rs. 130/-

نام کتاب	:	اقبال کا ادبی و تہذیبی ورثہ
مصنف	:	انیس چشتی
سنِ اشاعت اوّل	:	۲۰۰۸ء
قیمت	:	۱۳۰ روپے
کمپوزنگ	:	مظفر احمد (Ph: 020-26330068)
طباعت	:	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(India)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 091-011-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

علم شناس، علم نواز، شاہین صفت
مجاہدِ آزادی
اپنے والدِ بزرگوار
شکیل احمد چشتی کے نام
جنھوں نے مجھے بچپن میں ہی
اقبالؔ آشنا کر دیا تھا۔

فہرست

☆ وائے بر جانِ سخن.........!	از: مصنف	۵
☆ شذرات	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	۱۳
☆ عرضِ حال!	نذیر فتح پوری	۱۷
☆ مثنوی بر تعارفِ الحاج انیس چشتی	نذیر فتح پوری	۲۱
☆ اقبالؔ کا تصوّرِ وطن!		۲۳
☆ خدا کے حضور اقبالؔ کے منظوم مراسلے		۴۷
☆ اقبالؔ کا ادبی و تہذیبی ورثہ		۵۷
☆ علامہ اقبالؔ کی فارسی شاعری		۶۷
☆ کلامِ اقبالؔ میں تاریخ بیانی کا ادبی تناظر		۸۹
☆ اقبالؔ کا تصوّرِ شاہین		۹۹
☆ اقبالؔ اور جوشؔ کی شاعری میں انقلابی رجحانات!		۱۱۱
☆ اقبالؔ کا جادو		۱۲۹
☆ انڈکس	مولانا محمد غفران ندوی	۱۵۴

عکسی پلیٹیں

☆ اقبالؔ کی آخری رباعیات	(کتابت شدہ بخط نستعلیق)	۴۶
☆ عکسِ تحریر	مے باقی کی پہلی غزل	۸۸
☆ پیامِ مشرق کی پہلی نظم	اقبالؔ کے قلم سے	۱۱۰
☆ ارمغانِ حجاز کی ایک نظم	اقبالؔ کے قلم سے	۱۲۸
☆ مصنف کی دیگر کتابیں		۱۵۲

وائے بر جانِ سخن ...... !

اقبالؔ کو پاکستان میں مصوّرِ پاکستان کہا جاتا ہے۔ ہر قوم کو زندہ رہنے کے لیے اور اپنی تہذیبی روایتوں کے ڈانڈے دور تک ملانے کے لیے شخصیتیں درکار ہوتی ہیں۔ کسے شخصیت بنایا جائے اور کسے مٹی میں ملایا جائے، اس کا انحصار پورے طور پر اربابِ اقتدار پر ہے۔ یہی لوگ تاریخ کے دفینوں سے شخصیتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے ہیں اور بعض مرتبہ ناکارہ ترین لوگوں کو سرخاب کے پر لگا کر عوام کے سروں پر مسلّط کر دیتے ہیں ـــــــ مان نہ مان، میں تیرا مہمان ـــــــ ہماری آنکھیں ابھی چند روز پہلے یہ منظر دیکھ چکی ہیں کہ بعض شخصیتوں کے مجسموں کو گلے میں رسّی ڈال کر سرِ بازار زمین بوس کیا گیا، بعض کو بُل ڈوزروں سے پارہ پارہ کر دیا گیا اور بعض کو میڈیا کے لوگوں کی موجودگی میں توپ دم کر دیا گیا۔ لیکن یہ بات اپنے آپ میں کم حیرت انگیز نہیں ہے کہ بھارت میں ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کو قومی گیت تسلیم کیے جانے کے باوجود پاکستان نے اقبالؔ کو اپنا ہیرو تسلیم کر رکھا ہے اور بھارت نے اقبالؔ کو ان دونوں ملکوں کے درمیان کبھی بھی رسّہ کشی کا موضوع بننے نہیں دیا۔ اس میں جہاں بھارت کے دانشوروں اور اربابِ سیاست کا بڑ کپن ہے وہیں اقبالؔ کی آفاقیت اور ہمہ گیریت کو بھی بڑا دخل ہے۔ حیرت انگیز طور پر یہ اعزاز صرف اور صرف اقبالؔ کے ہی حصّے میں آیا ہے کہ اسے بیک وقت دو اور بظاہر ''دشمن'' ملکوں کے ''قومی شاعر'' ہونے کا شرف حاصل ہے۔

زیرِ نظر تصنیف میں اقبالؔ کے اسی ورثے کو اپنی دانست میں اجاگر کرنے کی

کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کے اکثر عناوین قومی اور بین الاقوامی سیمیناروں میں مقالہ جات کی صورت میں پیش کیے جا چکے ہیں اور ہر مقالہ خوانی کے بعد مصنف کو پذیرائی اور پسندیدگی کے جس تجربے سے گذرنا پڑا ہے، اس کیفیت نے ہی دراصل اسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ان مقالہ جات کو اکٹھا کرے اور ان کی اشاعت کے لیے ہمت جٹائے ——— اپنے دور کے اخیر دنوں میں جب علی سردار جعفری نے ''کاروانِ ادب'' میں راقم کا ایک مقالہ ''کلامِ اقبالؔ میں تاریخ بیانی کا ادبی تناظر'' پڑھا تو بڑی دیر تک داد دیتے رہے اور اطلاع دی کہ، ''پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہوا کہ کلامِ اقبالؔ کا مطالعہ اس زاویے سے بھی کیا جاسکتا ہے'' ——— دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عالمی رابطۂ ادبِ اسلامی کے مذاکرۂ علمی سے جب ''خدا کے حضور اقبالؔ کے منظوم مراسلے'' پڑھ کر آڈیٹوریم سے باہر آیا تو سابق شیخ الجامعہ اور ڈاکٹر ذاکر حسین چیئر کے صدر نشین ضیاء الحسن فاروقی بھیڑ کو چیرتے ہوئے آئے اور گلے سے لگا کر اتنا پیار کیا کہ مجھے محسوس ہوا کہ دنیا ابھی علمی والدین اور سرپرستوں سے خالی نہیں ہوئی ہے۔ ہر مقالے اور تقریر کے ساتھ اہلِ علم و دانش نے قدر افزائی اور ہمت فروزی کا یہی معاملہ کیا، جس کے نتیجے میں آج یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اقبالؔ ادبِ انسانی کا سرمایۂ بہار ہیں۔ انھیں کسی ایک ملّت اور کسی ایک وطن کے لیے قید کر رکھنا انسانیت کے حق میں فالِ بد ہے۔ جہاں اسلام پیش کرنا جان جوکھوں کا کام ہو، وہاں اقبالؔ سے کام چلایا جاسکتا ہے اور اگر اسلام آفاقیت کی تعلیم دیتا ہے تو اقبالؔ کو کشمیر سے کنیا کماری تک اور اٹک سے کٹک تک قید کر کے رکھا نہیں جاسکتا۔ غیر منقسم ہندوپاک میں جس شخص کا دم گھٹتا ہو اور جو ستاروں کو گردِ راہ بنانے کی بات کرتا ہو، اُسے جغرافیائی، لسانی اور مذہبی حدود میں جکڑ کر رکھ دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے پھانسی پر لٹکائے جانے سے پہلے ہر قیدی سے پوچھ لیا جاتا ہے کہ، ''بتا تیری رضا کیا ہے؟''

اقبال پر ایک دوسرا بڑا ہی اوچھا واران کے پین اسلامی (Pan Islamic) ہونے کا کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال نے اپنی شاعری میں اسلام کو برتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے اقبال اسلامی نہ ہوتے تب بھی وہ ڈھونڈتے ڈھانڈتے اسلام تک پہنچ ہی جاتے۔ اسلام اقبال کی مصروفیت ہی نہیں بلکہ ضرورت بھی ہے۔ کیونکہ اس میں ہجرت، معراج، مساوات، وحدانیت، رسالت، حرکت، اضطراب، خود سپردگی، خداشناسی، فقر، روحانیت، بے باکی، جواں مردی، تاریخ سازی، براہیمی، کلیمی اور اسداللٰہی وغیرہ ایسی کیفیات انھیں میسّر تھیں جن کا گذر دوسرے فکر و فلسفوں میں کوسوں دور تک نہیں تھا۔ اقبال یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ اسلام محض نماز اور روزے کا ہی نام نہیں بلکہ ۔۔۔ خاک کے پردوں میں تسبیح و مناجات سے الگ ہٹ کر کسی چیز کا نام ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ اقبال اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے علاوہ بھی کسی کے پڑھنے کی چیز ہے۔ عام قاری کے دل سے اقبال کے خوف کو ختم کرنے کے لیے دورانِ تحریر جو کوشش کی گئی ہے اس سے آپ یقیناً لطف اندوز ہوں گے۔

اس کتاب کا پہلا عنوان ''اقبال کا تصوّرِ وطن'' ہے۔ جسے عصری تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جمعیت اقوامِ عالم (League of Nations) کی ناکامی اور اقوامِ متحدہ (United Nations) کے قیام کے بعد ایک لمحے کے لیے ایسا لگا تھا کہ وطنیت کا محدود سیاسی تصوّر اب تاش کے پتوں کی طرح بکھر جائے گا اور اس کی جگہ اب انسانی آفاقیت لے لے گی۔ لیکن حیرت انگیز طور پر پچھلے دس برسوں میں نام نہاد دہشت پسندی، اسرائیل نوازی، میڈیا کی بالادستی، مذہب پرستوں کی بنیاد پرستی اور عالمی گاؤں (Global Village) کے تصوّر نے تصوّرِ وطن کو فرقہ وارانہ وطن پرستی کا روپ دے دیا ہے۔ اس وطن پرستانہ ماحول کی حد یہ ہے کہ انگلستان نے اپنے آپ کو یورپ کے اتحاد سے الگ رکھا ہوا ہے، اس کا سکّہ یورو ڈالر میں شامل نہیں، گویا اب بھی انگریز تنکے پر کھڑا ہے۔ ہمارا یہ دعویٰ تو نہیں البتہ ایک عاجزانہ مشورہ ضرور ہے کہ اب تک

اقبالؔ کے تصوّرِ وطن کو جس انداز سے سوچا گیا تھا، زیرِ نظر مضمون میں اس سے بالکل الگ ہٹ کر سوچا گیا ہے اور ادب میں پہلی مرتبہ وطن کے فقہی تصوّر کو، ہجرت نبویؐ کے تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ راقم کا آج بھی یہ کہنا ہے کہ سیرتِ نبویؐ میں ''واقعہ ہجرت'' اور ''واقعہ معراج'' پر کام نہیں کے برابر ہوا ہے جبکہ یہ دونوں واقعات پوری انسانی زندگی کو تہ و بالا کرنے والے تھے۔ اقبالؔ کے تصوّرِ وطن کو قائم کرنے کے لیے واقعہ ہجرت کو تو بطورِ خاص زیرِ بحث لانا چاہیے۔ اس سمت میں ہم نے چونکہ پہل کی ہے اس لیے قلم کو باگ اور رکاب سے آزاد کرنے کی ہمّت نہیں کر پائے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس پر کھل کر بحث ہو، تاکہ دو چار ملاقاتوں میں ہمارا قلم بھی بے حجابانہ قرطاس پر چل پھر سکے اور وطن کی کوکھ سے جنمنے والے نئے فتنوں کو اپنی اَنٹھی منانے کا موقع نہ ملے۔ اس ضمن میں یہ ضرور عرض کر دیں کہ یہاں ہم نے جان بوجھ کر مولانا حسین احمد مدنیؒ اور ڈاکٹر علامہ اقبالؔ کے مابین بپا ہونے والے ''معرکہ وطن'' سے چشم پوشی اختیار کی ہے کیونکہ اگر اس بحث کو لے کر بیٹھ جاتے تو نئی فکر کی پیشکش میں کھانچیں پڑ جاتیں اور کسی ایک فریق کی جانبداری یا غیر جانبداری کا شکار ہونا پڑتا۔ اس میں سب سے بڑا جو حادثہ پیش آتا وہ یہ تھا کہ موضوع کی تفصیل کے دَوران نئی بات پیش کرنے کی بجائے تاویلات کی ایک کھتونی پیش کرنی پڑتی۔

زیرِ نظر کتاب کے ساتھ ایک چھوٹا سا حادثہ پیش آ گیا۔ اس کتاب میں مقدمے کے طور پر اقبالؔ شناس پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ کا شذراتی نوٹ شامل ہے۔ میں عام طور پر اپنی کتابوں پر کسی سے پیش لفظ، تقریظ یا مقدمہ نہیں لکھواتا۔ اس جھمیلے میں کتاب کو جس طویل انتظار سے گذرنا پڑتا ہے اس میں مصنف اور قاری، دونوں کا نقصان ہے۔ میری صرف دو کتابوں پر آپ کو مقدمے ملیں گے، ایک ہے مراٹھی کی मदरसे आणि जागतिक दहशतवाद اور دوسری ہے ''تعلیم شناسی''۔ مراٹھی کتاب پر بھا۔ د۔ کھیر کے علاوہ مراٹھی کے مشہور اہلِ قلم اور جرنلسٹ ارونِد گوکھلے نے بہت

شاندار مقدمہ لکھا ہے۔ تعلیم شناسی پر مشہور ماہرِ لسانیات اور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، سابق پروفیسر ام القریٰ یونیورسٹی، مکہ مکرمہ اور زندہ جاوید مزاح نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی کے بھتیجے وصی احمد صدیقی نے ایک ہفتے کے اندر اندر ازراہِ کرم مقدمہ اور تعارفی نوٹ تحریر کر دیا تھا۔

اقبالؔ چونکہ ایک آفاقی اور ہمہ جہتی موضوع ہے اس لیے دوستوں کی فرمائش ہوئی کہ اس پر پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے چند سطریں لکھوالی جائیں۔ اس سے کتاب کی قدر و قیمت اور اہمیت میں اضافہ ہو جائے گا۔ میں نے حکم کی تعمیل میں فوری طور پر مسوّدہ آزاد صاحب کی خدمت میں بھجوا دیا۔ یہ اگست ۲۰۰۳ء کی ۴؍تاریخ تھی۔ اب میری صبر آزمائی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک طرف ڈی ٹی پی کا کام شروع کر دیا گیا اور دوسری طرف میں اپنی مصروفیتوں میں سے وقت نکال نکال کر جگن ناتھ آزاد صاحب کو بذریعہ خط، ٹیلی فون اور دیگر ذرائع سے یاد دہانی کرواتا رہا۔ تقریباً ۵؍ماہ کے طویل انتظار کے بعد ۲۴؍دسمبر ۲۰۰۳ء کو جگن ناتھ آزادؔ کے شذرات وصول ہو پائے جو شاملِ کتاب ہیں۔ ان شذرات نے مجھے پھر ایک مرتبہ شدید ذہنی الجھن میں مبتلا کر دیا، کیونکہ یہ تحریر پوری کتاب پر نہ ہوتے ہوئے دوسری ڈاک سے بھیجے گئے صرف ایک عنوان ''اقبالؔ کا تصورِ وطن'' پر تھی، جو کسی وجہ سے تاخیر سے بھیجا گیا تھا۔ جگن ناتھ آزاد صاحب نے ۵؍ماہ کے بعد جب تبصرہ لکھنے کا ارادہ ہی کر لیا تو ان کے سامنے پوری کتاب کا مسوّدہ سرے سے تھا ہی نہیں، صرف دوسری ڈاک سے بھیجا گیا ایک مقالہ اور دوسرے موضوعات کے چند اضافی صفحات تھے۔ اصل کتاب کا کیا ہوا؟ مجھے نہیں معلوم* ـــــ تاہم اصل مسودے کی رسید کے طور پر موصوف نے ۶؍اکتوبر کو مجھے جو خط لکھا ہے اسے پڑھ کر آپ اندازہ لگالیں گے کہ میں نے دوبارہ کیوں کوئی فرمائش نہ کی اور جگن ناتھ آزادؔ صاحب نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ صرف میرے لیے ہی نہیں بلکہ پورے اردو سماج کے لیے ایک غیر معمولی تحفہ ہے۔ رسیدی خط اس طرح ہے :

* تفصیل صـ ۱۹ پر

۲۶/اکتوبر ۲۰۰۲ء

محبِّ مکرم انیس چشتی صاحب، آداب

معافی کا خواستگار ہوں کہ آپ کا ۱۴/اگست ۲۰۰۲ء کا عنایت نامہ مسودے سمیت آج میرے نوٹس میں لایا گیا۔

Cancer نے سات آٹھ برس بعد پھر حملہ کیا ہے اور میں اپریل سے Rajiv Gandhi Cancer and Research Institute, Delhi میں زیرِ علاج ہوں۔ پہلے ڈیڑھ ماہ radiation کے ذریعے علاج ہوتا رہا۔ پھر جموں آنے کے لیے ایک ماہ کی چھٹی ملی۔ پھر بیس روز radiation ہوا اور تین ماہ کی چھٹی ملی۔ چونکہ ڈاکٹر نے لکھنے پڑھنے کے کام سے منع کر رکھا ہے اس لیے گھر کے لوگ ایسی خط و کتابت جس میں کچھ لکھنے کی فرمائش ہو مجھ سے چھپا لیتے ہیں۔ آپ کے کرم نامے اور مسودے سے بھی اہلِ خانہ نے یہی سلوک کیا۔ یہ مسودہ آج ہی میرے سامنے آیا ہے۔ میں معافی کا خواستگار ہوں۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ میں ڈاکٹروں کی زیرِ ہدایت آج تیسری بار علاج کے تسلسل کے لیے دہلی جا رہا ہوں۔ خیال یہ ہے کہ چونکہ حالت بہتر ہے میں آٹھ دس روز تک واپس آجاؤں گا۔ آپ ازراہ کرم اس دوران میں ایک خط مجھے لکھ دیں کہ کیا میری تحریر کی ابھی تک ضرورت ہے۔ اگر ہے تو میں چند روز میں لکھ کے آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔

امید کہ آپ ہر طرح سے خیریت سے ہوں گے۔

والسلام

میں دوران کے بعد میں ضرور لکھتا ہوں کیوں کہ یہی صحیح ہے۔

نیاز مند

جگن ناتھ آزاد

دیکھا آپ نے ! اب میں کیسے ہمت کر سکتا تھا کہ اتنے باہمت شخص سے دوبارہ فرمائش کروں کہ کتاب کا اصل مسوّدہ ڈھونڈ نکالیں اور دوبارہ پوری کتاب پڑھ کر مجھے مکرّر ایک بھرپور مقدمہ لکھ بھیجیں۔ متعدد مرتبہ ٹیلی فون کرنے پر یہ بھی پتہ چلا کہ ان کی اہلیہ بھی علیل ہیں اور یہ کہ انھوں نے ممبئی کے سیمنار میں شرکت کا ارادہ بھی ترک کر دیا ہے ——

چنانچہ اب جو تحریر شامل ہے وہ پوری کتاب پر نہ ہوتے ہوئے صرف ایک مضمون اور دیگر مضامین کے چند اضافی صفحات پر مشتمل ہے، مجھ جیسے بے بضاعت شخص کے لیے اتنا ہی بہت ہے۔ اُردو والوں کے لیے سب کچھ نہ سہی، تبرک ہی سہی۔

اسی دوران کتاب کے ساتھ ایک اور حادثہ پیش آیا۔ پریس میں جس کمپیوٹر پر یہ کتاب DTP کے مراحل سے گذر رہی تھی، مرمّت کے دوران اس کی ہارڈ ڈسک بلندی سے زمین پر گر پڑی اور پلک جھپکنے سے پہلے، اس کتاب کے علاوہ اس میں موجود پورا DATA علاّمہ اقبالؔ کے شاہین کی طرح اڑ گیا۔ کتاب اپنے بالکل آخری مراحل میں تھی اور اس کے چار پروف پڑھے جا چکے تھے۔ ڈی ٹی پی والوں کے ساتھ میں بھی ماتم کرنے والوں کی صف میں شامل ہو گیا۔

بڑی ہی ناسپاسی ہوگی اگر اس مرحلے پر بشیر احمد انصاری صاحب کا شکریہ ادا نہ کیا جائے۔ ان کی نظر جملے کی دکھتی رگ پر اور الفاظ کی دروبست پر رہتی ہے۔ کاتب کی غلطی کا ان کی نظر سے بچ نکلنا محال ہے۔ بڑی عرق ریزی سے انھوں نے کتاب کے پروف پڑھے اور املا نویسی نیز زبان کی ایسی باریک باتوں کی طرف میری توجہ منعطف کروائی جس کے لیے اُن کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کے پروپرائٹر محمد مجتبیٰ خان اور ان کے صاحبزادے مصطفےٰ کمال پاشا میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنے وقیع ادارے سے

اس کتاب کی اشاعت کو منظور فرمایا۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کا اشاعتی میدان میں اپنا ایک مقام ہے۔ انھوں نے اردو کی اس دور میں جتنی خدمت کی ہے اور کر رہے ہیں وہ اپنے آپ میں ایک نظیر ہے۔ یہ دونوں حضرات یقیناً میرے اور آپ کے شکریے کے مستحق ہیں۔ اس کتاب کی فنی خوبیوں کی انہیں داد دیجیے اور علمی کوتائیوں کے جواب مجھ سے طلب کیجیے۔ ممکن ہے دوسرے ایڈیشن میں انھیں درست کر دیا جائے۔

امید ہے کہ یہ کوشش صرف اربابِ حل و عقد میں ہی نہیں بلکہ اقبال کے ہر مداح، ہر استاد اور ہر طالبِ علم کے ذریعہ بنظرِ استحسان دیکھی جائے گی۔

پونہ

بروز جمعہ ۲/ذی قعد ۱۴۲۴ھ

۲۶/دسمبر ۲۰۰۳ء

انیس چشتی

116,Sterling House,1984 Convent Street,

PUNE- 411001(INDIA)

□□□

(سلطان ٹیپو کی وصیت : ضربِ کلیم)

اقبال کے کلام میں انقلاب، حرکت و عمل کا دوسرا نام ہے۔ حرکت و عمل کو پیدا کرنے کے لیے رزقِ حلال شرطِ اوّلین ہے۔ اس ضمن میں اقبال کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں ۔

شذرات

از اقبال شناس پروفیسر جگن ناتھ آزاد

مجھے انیس چشتی صاحب نے اپنی زیرِ تصنیف کتاب کے پہلے تیرہ اوراق بھیجے ہیں جن پر عنوان درج ہے ''اقبال کا تصوّرِ وطن'' اور ضمنی عنوان ہے ''عصری تناظر میں فکرِ اقبال کی نئی توجیہہ''۔ اور ایک ورق اور بھی ہے جس پر نمبر درج نہیں، معلوم نہیں یہ مسوّدے کے کس حصّے سے لیا گیا ہے۔ اس کے اوپر کی سطر میں لکھا ہے، ''اقبال کا جادو'' کے آگے لیں۔ اس صفحے کی عبارت میں انھوں نے اپنی ایک تقریر کا ذکر کیا ہے، جس میں انھوں نے اقبال کی نظم ''نیا شوالہ'' سنائی۔ جسے سن کر ''مجمع بے حال ہوگیا، تالیوں کی گونج میں لگتا تھا کہ آڈی ٹوریم کی چھت اُڑ جائے گی''۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ ۳۳ سے ۳۹ تک سات صفحات اور ہیں، جن پر مندرج تحریر کا ذکر میں آخر میں کروں گا۔

وطن کے تصوّر پر فلسفیانہ بحث انھوں نے عراق پر امریکہ کے حملے سے شروع کی ہے۔ عراق پر امریکہ کے حملے کی نام نہاد وجہ جواز کہ ''عراق کے پاس انسانیت کے لیے تباہ کن ہتھیار ہیں۔'' انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ عراق نے ''امریکہ کی عمارتوں پر دہشت گردانہ حملوں کی پشت پناہی کی ہے۔'' اسی پیراگراف میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''سب جانتے ہیں کہ امریکہ کا مقصد عربوں کے تیل کی دولت تک پہنچنا تھا...... دوسرے لفظوں میں یہ کہ اپنے ملک کے عوام کی مسرتوں کے لیے دوسرے ملک کے عوام کو لقمۂ اجل

بنایا جائے اور ان کی لاشوں پر بیٹھ کر اپنے وطن کی خوشحالی کے نقشے بنائے جائیں۔''

اِس کے بعد لفظ ''وطنیت'' کا انگریزی ترجمہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''یہ محدود تصوّر زیادہ قدیمی نہیں ہے۔'' یہاں سے وہ علامہ اقبالؔ کے تصوّرِ وطنیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں، ''علامہ اقبالؔ نے اسی وطنیت کے محدود تصوّر کی مخالفت کی تھی۔'' اس جملے کو مکمل کرتے ہوئے وہ علامہ اقبال ہی کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ، ''وطن کی مخالفت بلکہ اس تصور کی مخالفت کرتے ہوئے وہ (یعنی اقبالؔ) لکھتے ہیں :

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

یہاں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اقبالؔ نے وطن کی مخالفت کبھی نہیں کی۔ ہاں انیس چشتی صاحب سے یہ سہو ہوا ہے کہ انھوں نے جس نظم سے یہ بند اور پھر بعد میں تین اور بند حوالے کے طور پر درج کیے ہیں اس نظم کے مکمل عنوان پر نظر نہیں ڈالی۔ اس نظم کا عنوان صرف ''وطنیت'' نہیں ہے، بلکہ عنوان ہے

وطنیت

یعنی وطن بحثیت ایک سیاسی تصوّر کے

اور پھر حقیقت بھی یہی ہے کہ اقبالؔ نے سیاسی عینک لگا کر وطن کو کبھی نہیں دیکھا۔ اقبالؔ کا تصوّرِ وطن

اُس شعر میں پوری طرح اور واضح ترین طور پر موجود ہے، جو مذکورہ نظم کے تیسرے بند میں ٹیپ کا شعر ہے یعنی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوّتؐ میں وطن اور ہی کچھ ہے

فاضل مصنف نے وطن کے جذباتی تصوّر، وطن کے سیاسی تصوّر اور وطن کے فقہی تصوّر پر بڑی مفصّل بحث کی ہے۔ اس مفصّل بحث کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس بحث میں انیس چشتی صاحب نے علم و فضل کے دریا بہا دیے ہیں۔

اس مفصّل بحث کے علاوہ جن سات صفحات کا میں نے ذکر کیا ہے ان میں انیس چشتی صاحب نے ایک بہت عمدہ بات لکھی ہے اور وہ یہ کہ ''علّامہ اقبالؔ کی ایجابی فکر کو سمجھنے کے لیے ان کے فارسی کلام کا مطالعہ اشد ضروری ہے۔'' ان کے اس خیال سے پوری طرح اتفاق کرتے ہوئے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میں انتہائی جلی قلم سے کتاب کا عنوان ''اقبالؔ کا تصوّرِ وطن'' دیکھ کر اس خیال میں رہا کہ کتاب کا نام یہی ہے اور اقبالؔ کے تصوّرِ وطن کا انھوں نے اسی فارسی کلام والے باب میں ''ارمغانِ حجاز'' تک کی شاعری کا جائزہ لیا ہوگا۔ لیکن ''بانگِ درا'' کے بعد انھوں نے اقبالؔ کے تصوّرِ وطن کا جائزہ نہیں لیا حالانکہ اردو میں ''ضربِ کلیم'' اور فارسی میں ''جاوید نامہ''، ''پیامِ مشرق'' اور ''ارمغانِ حجاز'' علّامہ مرحوم کے تصوّرِ وطن کی خوشبو سے مہک رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ میرا یہ خیال ہی غلط ہو کہ کتاب کا نام ''اقبالؔ کا تصوّرِ وطن'' ہے اور یہ اقبالؔ کی شاعری پر مختلف مضامین کا مجموعہ ہو، کیونکہ زیرِ نظر صفحات میں انھوں نے فارسی زبان کے محاسن اور اقبالؔ کی فارسی شاعری کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے اقبالؔ کی دو فارسی نظموں ''فصلِ بہار'' اور

''خدی'' (نغمۂ سار بانِ حجاز) شاملِ کتاب کی ہیں اور اِن دونوں کے اردو میں خوبصورت ترجمے کر کے ان نظموں کے کیف کو ان قارئینِ کرام تک پہنچایا ہے جو فارسی سے واقف نہیں ہیں۔ یہ ایک بڑا اہم کام ہے۔ اگر انیس چشتی صاحب اسی طرح اقبالؔ کے فارسی کلام کے بعض اور حصّوں کا بھی اردو میں ترجمہ کر کے اہلِ نظر کے سامنے لائیں تو یہ ان کا اردو اور فارسی دونوں پر احسان ہوگا۔

جگن ناتھ آزادؔ

۱۹ر دسمبر ۲۰۰۳ء

□□□

عرضِ حال!

علامہ اقبال کے مخالفین ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ جب پہلی بار ''بانگِ درا'' شائع ہوئی تو علامہ اقبال کے خواجہ تاش پنڈت سبھو رام جوش ملسیانی نے لاہور کے پارس نامی اخبار میں ''جراح'' کے فرضی نام سے سلسلہ وار مضامین لکھ کر بانگِ درا کی خامیوں کی نشان دہی کی، یہ مضامین دس قسطوں میں شائع ہوئے۔ بعد میں نریش کمار شاد کے والد نوہریارام درد نے انھیں کتابی شکل میں ''اقبال کی خامیاں'' نام سے شائع کر دیا اور خود ہی اقبال کی خدمت میں کتاب پیش کرنے کے لیے حاضر ہوئے، اقبال کو معلوم تھا کہ یہ مضامین جراح کے فرضی نام سے جوش نے لکھے ہیں۔ درد، کالی داس گپتا رضا کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

> علامہ مونڈھے پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ انھیں مضامین کی اشاعت کا علم تھا اور یہ بھی علم تھا کہ جوش ملسیانی کے لکھے ہوئے ہیں۔ کتاب کو الٹ پلٹ کر کہیں کہیں سے دیکھا اور پیشانی پر بغیر کوئی بل لائے ہوئے فرمایا کہ ''جوش میرے خواجہ تاش ہیں۔ میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کیجیے گا اور کہیے گا کہ میں کتاب سے استفادہ کروں گا۔''
>
> (یہ واقعہ ۱۹۲۸ء کا ہے)

(اقبال کی خامیاں، تیسرا ایڈیشن، سن اشاعت ۱۹۹۴ء۔ مرتب کالی داس گپتا رضا)

پچاس سال بعد ۱۹۷۷ء میں جوش کے فرزند عرش ملسیانی نے ''اقبال کی خامیاں'' جوش ملسیانی کے نام سے شائع کی، عرضِ حال میں عرش لکھتے ہیں:

"بیچارے اقبال کا یہ حال ہے کہ ایک مفکر اور فلسفی ہونے کے باوجود اسے ذریعۂ اظہار بہتر صورت میں نہ ملا۔"

عرش کو اس بات کا افسوس تھا کہ اقبالؔ نے اسلامی فلسفے کو اپنے اظہار کا وسیلہ اور فکر کا منبع کیوں بنایا، اسے ہندوستانی فلسفے نظر نہیں آئے، اسی بنا پر عرش نے اقبال کو "عصبیت پسند" لکھا ہے۔

آج بھی علامہ اقبالؔ کے خلاف انور شیخ مسلسل لکھ رہے ہیں۔ انور شیخ اقبال کے سر سے حکیم الامت کا تاج نوچ کر انھیں "غارت گرِ ملّت" ثابت کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ "فکرِ اقبال پر تنقیدی نظر" انور شیخ کی ایک ضخیم کتاب ہے جس کے حرف حرف سے مخاصمت اور اقبال دشمنی کی چنگاریاں نکلتی محسوس ہوتی ہیں۔

اقبال پنجابی تھے۔ ان کی مخالفت بھی اکثر پنجابی اہلِ قلم ہی نے کی ہے۔ جوش ملسیانی اور انور شیخ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ دونوں ہی پنجابی ہیں۔

اقبال کے مخالفین کے مقابلے میں "موافقین" کثرت سے رہے ہیں۔ جنھوں نے اقبال کے فلسفہ کو ان کی فکری تہوں کو اندر تک اتر کر نہ صرف یہ کہ کھنگالا ہے بلکہ ایسے ایسے نادر و نایاب موتی چن کر لائے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

انیس چشتی ابتداء ہی سے نہ صرف یہ کہ اقبال کے شیدا رہے بلکہ وہ اقبال کے افکار و خیالات کے مبلغ و مرسل بھی رہے ہیں اپنی تحریر و تقریر کے وسیلوں سے انھوں نے اقبال کا پیغام عام کرنے کی کوشش کی۔ ۲۳ رسال قبل اسباق میں ان کا پہلا مضمون "اُردو کا مظلوم شاعر" عنوان سے شائع ہوا۔ اس کے بعد مختلف رسائل میں مختلف عنوانات سے مضامین آتے رہے۔ آج یہ مضامین کتابی صورت میں آ رہے ہیں۔ پونہ سے "اقبالیات" پر یہ پہلی کتاب ہے کتاب کا مسودہ پیش لفظ لکھنے کے لیے جب میں نے ماہرِ اقبالیات، پروفیسر جگن

ناتھ آزاد کی خدمت میں ارسال کیا تو وہ سخت علیل تھے۔ اس وقت ان کی عمر ۸۶/ برس ہے۔ اپنے ایک مکتوب میں وہ تحریر فرماتے ہیں۔

انیس چشتی صاحب کی کتاب کے بارے میں مجھے کچھ لکھنا چاہئیے تھا لیکن میری غیر حاضری میں گھر میں جو ڈاک موصول ہوتی رہی وہ میں گھر واپس آکر پورے طور سے نہیں دیکھ سکا تھا۔ اب آپ اندازہ کریں کہ نو دس ماہ کی ڈاک کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ چشتی صاحب کا پارسل میں نے خود کھولا تھا۔ اس کا ایک حصہ دوسرے سے الگ ہو گیا اور میں علالت کی بنا پر چند صفحات والے (حصے) کے علاوہ باقی اوراق بھول گیا۔ جب لکھ چکا تو وہ ہی ڈاک کے انبار سے برآمد ہوا۔ اپنی حماقت پر بہت افسوس ہوا لیکن ہاتھ میں آرتھورائٹس کے درد نے یہ اجازت نہ دی کہ اپنی مختصر سی تحریر میں (سارے مسودے کو سامنے رکھکر) اضافہ کروں۔

(مکتوب بنام نذیر - ۲۳/دسمبر ۲۰۰۳ء)

زیر مطالعہ کتاب انیس صاحب کی ۳۰ ویں کتاب ہے۔ وہ جتنی ہنر مندیوں اور فصاحت کے ساتھ اُردو میں لکھتے ہیں اسی سرعت سے ان کا قلم مراٹھی میں بھی رواں دواں نظر آتا ہے۔ چونکہ وہ تحریکِ پیام انسانیت سے نہ صرف یہ کہ وابستہ ہیں بلکہ اس کے کل ہند سیکریٹری بھی ہیں۔ غیر مسلم برادرانِ وطن کے سامنے موصوف نے اسلام کی حقیقی روشنی پہنچا کر بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ مراٹھی پریس نے آپ کے ایک ایک حرف

کو عزت بخشی اور اپنے اخبارات کے ذریعہ عوام تک پہنچایا ہے۔

اقبالیات پر یہ انیس صاحب کی پہلی کتاب ہے۔ اقبالیات کا موضوع ایک سمندر کی مانند ہے، پہلے تو کوئی اس میں اترنے کی ہمت نہیں کرتا۔ جو با حوصلہ اور علم سے لدے پھندے غواص اس سمندر میں اترتے ہیں وہ اپنی حیثیت اور تلاش کے مطابق موتی نکال لیتے ہیں۔ انیس صاحب نے بھی یہی کیا ہے۔

اس کتاب کی اشاعت پر دلی مبارکباد!

نذیر فتح پوری

۱۹ر جنوری ۲۰۰۴ء، پونہ

□□□

مثنوی بر تعارفِ الحاج انیس چشتی

نذیر فتح پوری

اے خدا! اے مالکِ دنیا و دیں
تیرا ہمسر دوسرا کوئی نہیں
کبریائی زیب دیتی ہے تجھے
ہر بڑائی زیب دیتی ہے تجھے
صاحبِ لوح و قلم ہے تیری ذات
سب سے اعلیٰ اور اولیٰ تیری بات
تو نے ہی علم و ہنر ہم کو دیا
تو نے بخشا ہم کو عرفانِ الہ
آدمی کیا اور کیا اس کا کمال
آدمی کی ذات تھی ''ذرّہ مثال''
آدمی کو جو ملا ہے مرتبہ
سارا صدقہ ہے رسولِ پاکؐ کا
جب محمدؐ کے ملے نقشِ قدم
ظلمتوں کے غار سے نکلے ہیں ہم
جو بصیرت، جو بصارت عام ہے
کملیؐ والے کا یہ سب انعام ہے
آیئے آگے بڑھاتے ہیں قدم
داستاں کچھ اور کرتے ہیں رقم
فرض مجھ کو آج یہ سونپا گیا
میرے ہی حق میں ہوا یہ فیصلہ
چھپ رہی ہے جن کی کاوش برملا
حق تعارف کا کروں ان کے ادا
کہتے ہیں کہ یہ انیسِ علم ہیں
میں کہوں گا ہم جلیسِ علم ہیں
آپ کو جب جب بھی محفل میں سنا
آپ کی تقریر نے جادو کیا
آپ کی تقریر بھی ہے دلنشیں
آپ کی تحریر بھی ہے دلنشیں

10615

بات ہو مذہب کی یا ذکرِ ادب — آپ کی ہیں دسترس میں سب کے سب
علامہ اقبال کے افکار پر — آپ رکھتے ہیں بہت گہری نظر
نکتہ سنجی میں ہیں یہ اپنی مثال — شعر کی تفہیم کا بھی ہے کمال
تالیف و تصنیف کے ہیں سلسلے — رابطہ ہے عالمِ اسلام[1] سے
تیس سے زائد کتابیں آپ کی — ہر طرف پھیلا رہی ہیں روشنی
کام کیسے کیسے کرتے ہیں ادق — آرمی کو یہ پڑھاتے ہیں سبق[2]
کر پاساگر[3] کے مدوِن آپ ہیں — بالغانِ قوم کے بھی باپ[4] ہیں
ندویؒ[5] صاحب کی دعا کا ہے اثر — کامیابی جو ملی ہر گام پر
یہ مسرت کی گھڑی ہے دوستو! — آج کی ساعت بڑی ہے دوستو!
آؤ مل کر ہم پڑھیں حرفِ دعا — اور پھر آمین بھی کہہ دیں ذرا
ہے دُعا کہ یہ ہمیشہ سچ لکھیں — جب کہیں تو خیر کا کلمہ کہیں
رنگ یہ تحریر میں بھرتے رہیں — رہبری اذہان کی کرتے رہیں

اے نذیر اب تم قلم کو روک لو
اور بس آمین ہی دل سے کہو

۱ رکنِ عالمی رابطۂ ادبِ اسلامی
۲ استاذ زائرہ، انسٹی ٹیوٹ آف نیشنل انٹی گریشن (INI) کالج آف ملٹری انجینئرنگ، پونہ
۳ مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب ”رحمتِ عالمؐ“ کا مراٹھی ترجمہ اور دیگر مراٹھی تصانیف
۴ تعلیمِ بالغان پر شائع شدہ کتابوں کی طرف اشارہ ہے
۵ مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی طرف اشارہ ہے

□□□

اقبالؔ کا تصوّرِ وطن!

(عصری تناظر میں فکرِ اقبالؔ کی نئی توجیہہ)

ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے، ۲۰۰۳ء کے اوائل کی بات ہے، جب امریکہ نے عراق پر حملہ کرنے کی ٹھان لی تھی تو دنیا کے سارے ملکوں نے اس حملے کی مخالفت کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ انسانی تاریخ میں کسی ایک مسئلے پر کسی ایک ملک کے خلاف، اتنی بڑی تعداد میں لوگ سڑکوں پر احتجاج کے لیے پہلے کبھی نہیں نکلے تھے۔ اس مسئلے میں ساری دنیا ایک طرف اور امریکی صدر بُش تنہا ایک طرف رہنے کے باوجود بھی وہ کسی کی نہیں مانے اور انھوں نے عراق کو تاراج کرکے ہی دم لیا۔ اس سے پہلے افغانستان کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ واقع ہو چکا تھا۔ ہمیں یہاں اس بات سے بحث نہیں ہے کہ کون جیتا اور کون ہارا؟ بلکہ بحث اس بات سے ہے کہ سب سے زیادہ کسے نقصان پہنچا۔ بادی النظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ عراق چونکہ تاراج ہو چکا ہے اس لیے سب سے زیادہ نقصان اسی کو اٹھانا پڑا ہے؛ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ سامراجیت کی اس ضد میں سب سے زیادہ نقصان اقوامِ متحدہ کا ہوا ہے .... اقوامِ متحدہ کیا ہے؟ تمام ممالک کا ایک وفاق ہے، جس کا بنیادی مقصد عالم میں ''قیامِ امن'' ہے۔ اگر اس کی کوششوں کے باجود، اس وفاق کا کوئی ممبر، اس کی بات نہ مانے اور امن کو غارت کردے تو اس سے بڑی ناکامی اُس اِدارے کی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ جس کے پاس طاقت ہے وہ ہر ایک کی بات کو ٹھکرا سکتا ہے اور محض لاٹھی کے بل بوتے پر ساری دنیا میں اپنی بربریت کی نظیر قائم کر سکتا ہے .... یہ مذموم حرکت دیگر اقوام کے سامنے ایک کھلا چیلنج ہے

کہ اگر تمھیں بھی اپنی بات منوانی ہے یا من مانی کرنی ہے تو طاقت کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس فکر نے دنیا کے دوسرے ممالک کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیا ہے اور امریکی ہتھیاروں کی فروخت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

امریکہ نے اپنے اس حملے کا نام نہاد جواز یہ تشکیل کیا کہ عراق کے پاس انسانیت کے لیے تباہ کن ہتھیار ہیں، اُس نے امریکہ کی عمارتوں پر دہشت گردانہ حملوں کی پشت پناہی کی ہے اور یہ کہ عراق کی عوام آمرانہ ظلم و جبر کی شکار ہے اس لیے صدّام کو ہٹ جانا چاہیے۔ سب جانتے ہیں کہ امریکہ کا مقصد عربوں کی تیل کی دولت تک پہنچنا تھا اور اس نے وہ کام کر لیا۔ دوسرے لفظوں میں امریکی نیت اور حکمت عملی یہ تھی کہ اپنے وطن کی عوام کی مسرّتوں کے لیے دوسرے ملک کی عوام کو لقمۂ اجل بنایا جائے اور ان کی لاشوں پر بیٹھ کر اپنے وطن کی خوشحالی کے نقشے بنائے جائیں۔

وطنیت (Patriotism) کا یہ محدود تصوّر زیادہ قدیم نہیں ہے۔ یونان و مصر و روما کا تصوّر علاقائی اور نسلی تھا۔ بڑھتے ہوئے سامراجی شکنجوں، نئے ممالک میں اپنی بستیاں آباد کرنے کی فکروں اور نام نہاد جمہوری مزاجوں نے اس تصور کو تراشا ہے۔ حد یہ ہے کہ بعض حکومتوں نے اپنے ہی ملک کی عوام پر ظلم و جبر کے پہاڑ توڑنے کے لیے ایسے قانون وضع کیے ہیں جن میں بے قصور ملزم کو اپنے آپ کو معصوم اور بے گناہ ثابت کرنا پڑتا ہے اور ایسے ثبوت دینے پڑتے ہیں جن سے یہ شہادت بنے کہ میں سچّا محبِّ وطن ہوں اور میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس سے میرے وطن کے وجود اور سالمیت پر کوئی حرف آتا ہو۔ اس کی سب سے بڑی مثال دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک خود امریکہ کی ہے جس نے پوٹا کی طرز کا ایک قانون (Patriot Act) بنا رکھا ہے جس میں پولس اور فوج کو پورے اختیارات حاصل ہیں کہ وہ محض شک کی بناء پر کسی کو بھی گرفتار کر سکتی ہے اور من مانے الزامات لگا سکتی ہے۔ صفائی

پیش کرنا اور اپنے آپ کو معصوم ثابت کرنا ملزم کی ذمہ داری ہے۔ یہ سب اپنے وطن کی حفاظت کے نام پر کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر علامہ اقبال نے اسی وطنیت کے محدود تصوّر کی مخالفت کی تھی جو محکوم کے لیے ہلاکت آفریں اور ناپسندیدہ قوم کے لیے پیغامِ اجل ہے۔ اس قسم کی وطنیت کی مخالفت بلکہ اس تصوّر کی مخالفت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیّتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

(وطنیت : بانگِ درا)

مندر بالا اشعار پڑھیے اور اس تناظر میں عراق، افغانستان اور گجرات وغیرہ کے تباہ حال انسانوں کا جائزہ لیجیے۔ یہ تباہ حالی، وطن پرستانہ جارحیت کی منہ بولتی تصویر ہے۔

وطن کی سرحدیں حکمرانوں کی حرصِ کشور کشائی کے سبب گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ وہ افراد جو کل تک کسی ایک قطعۂ زمین پر بود و باش اختیار کرتے تھے، حکمرانوں کی فوج کشی کے نتیجے میں آج وہ کسی دوسرے وطن کے دست نگر اور باج گذار قرار پاتے ہیں۔ ملتوں پر جب جنگوں کا دورہ پڑتا ہے تو روزانہ سرحدیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ مغربی جرمنی کے باشندے، مشرقی جرمنی کے ادغام (*Unification*) کی وجہ سے ایک وسیع تر سلطنت کے باشندے بن جاتے ہیں۔ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے آج کے پاکستان میں رہنے والے، برطانوی آئین

کے وفادار تھے لیکن چند گھنٹوں کے اندر اندر ان کی وفاداریاں اسلام آباد سے جوڑ دی جاتی ہیں اور اس کا انکار کرنے والے کو وطن دشمن قرار دے کر ذلیل و خوار کیا جاتا ہے۔ کل کو اگر ہندوستان اور پاکستان ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں تو وطن کی بنیاد پر ان کی وفاداریوں کو پھر داؤں پر لگا دیا جائے گا۔ اقبالؔ جیسے بالغ نظر کو بہر حال اس شکست و ریخت کا جائزہ لینا ضروری محسوس ہوا اور اس نے خالصتاً اسلامی فکر کی بنیاد پر یہ بھی کہا کہ :

اِس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوّت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظّارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادِ وطن صورت ماہی
ہے ترکِ وطن سنّتِ محبوبِ الٰہی
دے تو بھی نبوّت کی صداقت پہ گواہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوّت میں وطن اور ہی کچھ ہے
(وطنیت : بانگِ درا)

جنگل کے وحشی جانوروں، فضا کے پرندوں اور سمندر کی مچھلیوں کے جغرافیائی علاقے تو ہوسکتے ہیں۔ان کی مجموعی آبادی کرۂ ارض پر بسنے والی انسانی آبادی سے کئی گنا زیادہ ہے۔ لیکن یہ سب بغیر ویزا اور پاسپورٹ کے آزادانہ گھوم پھر سکتے ہیں۔یعنی فطرت، وطن کی سیاسی جکڑ بندیوں سے آزاد ہے تاہم اِن اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے وطنیت کا ایک خاص تصوّر پیش کیا ہے، تبھی تو اقبالؔ کو ''گفتارِ سیاست کے وطن'' اور ''ارشادِ نبوّت کے وطن'' کے درمیان حدِ فاصل کھینچنی پڑی۔

دورِ حاضر میں ہر مسلمان کو ''وطن'' کے کم از کم تین تصوّرات سے سابقہ پڑتا ہے :

(الف) وطن کا جذباتی تصوّر

(ب) وطن کا سیاسی تصوّر

(ج) وطن کا فقہی تصوّر

اور یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ اس میں سے کسی بھی تصوّر کو اپنی زندگی میں برتتے وقت نہ تو اس کا ایمان خطرے میں پڑتا ہے اور نہ ہی اسلامی تصوّرات وعقائد اور Ethos پر کوئی آنچ آتی ہے۔ہم چاہیں گے کہ مندرجہ بالا تصوّرات کی ہلکی سی تفصیل آپ کی خدمت میں پیش کردیں۔ممکن ہے اسے پڑھ کر اقبالؔ کے تصوّرِ وطن کو بہتر طریقے پر سمجھنے میں مدد ملے اور بطورِ خاص اس شعر کا کچھ مطلب واضح ہوسکے

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوّت میں وطن اور ہی کچھ ہے

(الف) وطن کا جذباتی تصور

اسوۂ نبویؐ میں متعدد جگہ اپنے وطن کی محبت کا انتہائی جذباتی انداز میں اظہار ہوا ہے۔ ہر پڑھا لکھا شخص جانتا ہے کہ بعثت سے پہلے حضرتِ پاکؐ اپنے ساتھ پانی اور ستو لے کر گھر سے دور جبلِ نور میں واقع غارِ حرا میں تشریف لے جاتے اور ہفتوں وہاں قیام فرما کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہتے۔ اس بات سے بھی ہر کوئی واقف ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں آپؐ کو حضرت جبرئیلؑ کی زیارت نصیب ہوئی، جنھوں نے آپ کو مقامِ نبوّت پر سرفراز کیے جانے کی بشارت دی اور سورۂ علق کی ابتدائی ۵ / آیتیں وحی کی صورت میں آپؐ تک پہنچائیں۔ تمام علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ حضورؐ نے صرف دو مرتبہ حضرت جبرئیلؑ کو اُن کی اصلی شکل میں جسم کی آنکھوں سے دیکھا، اس میں پہلی مرتبہ اِس موقع پر یہ امر واقع ہوا جب آپؐ غارِ حرا میں تشریف رکھتے تھے۔ وحی، پیغمبری کی بشارت اور حضرت جبرئیلؑ کا دیدار، یہ سب کچھ اتنی جلدی اور اچانک ہو گیا کہ آپؐ کے جسمِ اطہر پر لرزہ طاری ہو گیا اور آپؐ فوراً جبلِ نور سے اتر کر اپنے مکان پر تشریف لے گئے۔ مکان پر پہنچتے ہی اپنی شریکِ حیات اور بعد میں اُمّ المومنین کے رُتبے پر فائز ہونے والی خاتون حضرت خدیجہؓ سے جو سب سے پہلا لفظ آپؐ نے ارشاد فرمایا، وہ تھا "زمّلوني ۔ زمّلوني" (مجھے اُڑھاؤ۔ مجھے اڑھاؤ) کیونکہ اس عجیب و غریب تجربے سے گذرنے کے بعد آپؐ کانپ رہے تھے۔

زیادہ تفصیل میں جائے بغیر ہم یہ عرض کر دیں کہ جب آپؐ کی طبیعت ذرا سنبھلی تو حضرت خدیجہؓ آپؐ کو لے کر اپنے رشتے کے بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں۔ اُن کی حیثیت اس وقت نہ صرف یہ کہ گھر کے بڑے بلکہ مکّہ مکرمہ کے مذہبی اور معزز لوگوں میں سے تھی۔ آپ دینِ موسوئ اور دینِ عیسوئ کے پابند تھے، گویا اُس وقت کے دیندار مسلمان

تھے۔ ورقہ بن نوفل انبیاءؑ کے اَدیان اور تواریخ سے واقف تھے، اہلِ کتاب میں سے تھے اور ایک عالمِ دین کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔

جب ورقہ بن نوفل نے اِس مردِ کامل اور صادق وامین سے تفصیلات سنیں تو فرمایا :

"والذي نفسي بيده إنك لنبى هذه الأمة، ولقد جاء ك الناموس الأكبر الذي جاء موسىٰ، و إن قومك سيكذ بونك، و يؤذونك، ويخرجونك، و يقاتلونك۔"

[ترجمہ: اُس کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ اِس امّت کے تم نبی ہو اور تم تک وہی ناموسِ اکبر آیا ہے جو حضرت موسیٰؑ کے پاس آیا تھا، تمھاری قوم تمھیں جھٹلائے گی اور تمھیں اذّیت دے گی اور تمھیں نکال دے گی اور تم سے جنگ کرے گی] (صحیح بخاری)

ورقہ بن نوفل کے اس بیان سے حضور پاکؐ چونک پڑے۔ آپؐ کو سخت تعجب ہوا کہ جو قوم مجھے صادق اور امین کہتے ہوئے نہ تھکتی ہو، وہ مجھے نکال دے گی؟ اس وقت حیرت واستعجاب کے عالم میں اور تو کسی بات پر نہیں البتہ نکال دیے جانے پر آپؐ نے حضرت ورقہ سے دریافت فرمایا، "أومخرجي هم؟" [کیا یہ لوگ مجھے نکادیں گے؟]

اس پر ورقہ بن نوفل نے کہا، " نعم، لم يأت رجل قط بمثل ما جئت به إلا عاداه الناس و حاربوه، وإن أدركتُ ذلك اليوم، وطا ئت بي الحياة، نصرتُك نصراً قوياً۔" (حضرت عائشة، الجامع الصحيح البخاری)

[ترجمہ : ہاں! کوئی بھی ایسا نہیں گذرا (جیساتم پیغام لائے ہو) جس کے ساتھ لوگوں نے دشمنی نہ لی ہو۔ اگر میں وہ دن پاتا اور (میری) زندگی لمبی ہوتی (تو) میں تمھاری بھرپور مدد کرتا۔]

ہم چاہتے تو یہاں صرف اُردو ترجمے سے ہی اکتفاء کرتے لیکن عمداً

شریف کی حدیث کے الفاظ نقل کیے ہیں، تاکہ سند رہے۔ اس پوری حدیث میں جو چیز سب سے زیادہ چونکا دینے والی ہے وہ وہی ہے جس پر آپؐ چونکے تھے یعنی لفظ ''ویخرجونك'' (اور تمھیں نکال دیں گے)۔ حالانکہ سب سے زیادہ چونکا دینے والی باتیں تو اس حدیث میں کئی ایک ہیں مثلاً :

۱۔ ناموس الاکبر = بمراد حضرت جبریلؑ

۲۔ جاء موسیٰ = جو حضرت موسیٰؑ کے پاس آیا تھا۔

۳۔ سَیُکَذِّبُوْنَكَ = تمھاری قوم تمھیں جھٹلائے گی۔ (جبکہ قوم میں آپؐ صادق مشہور تھے۔)

۴۔ وَیؤذونك = اور تمھیں اذیت دے گی

۵۔ وَیُقاتِلُونَكَ = اور تم سے قتال (جنگ) کرے گی

لیکن سرورِ کائناتؐ سب سے زیادہ جس فقرے پر چونکتے ہیں وہ ہے "وَیُخرِجُونَكَ" (اور تمھیں نکال دیں گے) اور بے ساختہ آپ کی زبانِ مبارک سے نکلتا ہے اَوَ مُخرِجِيَّ هُم ؟ یعنی ''کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟'' اپنے وطن سے جدائی کی اس اچانک اطلاع نے آپ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ جہاں آپ کو بیت اللہ شریف کے قرب کا شرف حاصل تھا۔ یہ جملہ اِس بات کی دلیل ہے کہ آپ کو اپنے وطن سے جذباتی لگاؤ تھا۔

اس مرحلے پر حضورؐ کا چونکنا ایک بالکل فطری عمل تھا۔ ابھی دین وشریعت کی تدوین نہیں ہوئی تھی۔ انسانیت کی فلاح اور صلاح کے لیے احکامات اترنے ابھی باقی تھے۔ ابھی تو قرآنِ کریم کی صرف ابتدائی ۵؍آیتیں "اقراء ...... علم الانسان مالم یعلم" تک ہی نازل ہوئی تھیں۔ اس وقت تک کوئی بھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ ۵؍آیتیں آگے بڑھ کر پوری کائنات کو اپنے احاطے میں لے لیں گی اور ان کی تعداد چھ ہزار دو سو سینتیس☆ (6237) ہو جائے گی۔

☆ بعض مفسرین کے نزدیک ان آیات کی تعداد ۶۲۳۸؍ ہے کیونکہ وہ سورۂ فاتحہ کی، بشمول بسم اللہ، ۷؍آیتیں تسلیم کرتے ہیں۔

انسان کے لیے سب سے آرام اور سکون کی جگہ اس کا گھر ہوتا ہے۔ ذہنی اور جسمانی آسودگی جو اُسے اپنے گھر والوں میں نصیب ہوتی ہے اتنی کسی اور جگہ میسّر نہیں آسکتی۔ دنیا کی آخری عبادت گاہ اگر بیت اللہ شریف ہے تو دنیا کی آخری تحفظ گاہ اپنا گھر ہے، اور جس مقام پر یہ دونوں چیزیں جمع ہو جائیں، اس مقام کی محبت کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ ہم معمولی معمولی جگہوں پر رہتے ہیں، لیکن اس جگہ سے ایسا پیار کرتے ہیں کہ نکالے نہیں نکلتے۔

ایک عام انسان کو، جھونپڑے میں رہنے والی بڑھیا کو، کھیتوں-کھلیانوں میں کام کرنے والے بندھوا مزدور کو، وطن، حبِّ وطن، نیشنلزم اور نیشنلٹی جیسے بڑے بڑے ناموں سے کچھ لینا دینا نہیں۔ اسے تو محبت ہوتی ہے اس جھونپڑی سے جہاں اس نے پہلی بار اپنی ماں کا چہرہ دیکھا تھا۔ اسے تو محبت ہوتی ہے اس گلی اور میدان سے جہاں وہ پہلی بار اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلا تھا۔ پڑھے لکھے اور دانش مند لوگ خود ایک مثال سے اس کیفیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بچپن میں جس مقام پر کسی وجہ سے ہم تھوڑے دنوں کے لیے رہ جاتے ہیں یا چھٹیاں گذارنے چلے جاتے ہیں اور پھر طویل عرصے کے بعد دوبارہ اسی مقام پر کسی وجہ سے پہنچتے ہیں تو میزبانوں سے فرمائشیں کر کر کے اس جگہ لے چلنے کا اصرار کرتے ہیں جہاں ہم نے بچپن کے کچھ دن بتائے تھے۔ رام لعل اردو کے بہت مشہور افسانہ نویس تھے۔ وہ اور ان کا خاندان ۱۹۴۷ء میں ترکِ وطن کر کے ہندوستان آ گیا تھا۔ کئی برسوں کے بعد کسی پروگرام میں شرکت کرنے کے لیے جب انھیں دوبارہ لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو وہ اپنے آبائی مکان گئے جو اب کسی دوسرے کے قبضے میں تھا۔ نئے مکینوں نے ان کی بہت خاطر تواضع کی۔ وہ جب چلنے لگے تو انھوں نے رام لعل کو کچھ ہدیے پیش کرنے چاہے۔ مہمان نے ہر چیز لینے سے انکار کر دیا اور ایک عجیب و غریب چیز کی فرمائش کی...... کہا کہ، ''اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں اپنے آنگن کی تھوڑی سی مٹی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں'' .... اور

پھر وہی ہوا۔ انھوں نے خود اپنے ہاتھ سے وہ مٹی بھری جس میں ان کے اپنے بچپن کی یادیں، ماں کی لوریاں اور زندگی کے سہانے سپنے پیوست تھے۔ اس طرح وہ اپنے وطن کی مٹی لانے میں کامیاب ہو گئے، جس کے لیے دنیا کا کوئی قانون، کسی قسم کا پوٹا اور کوئی امریکی Patriot Act لاگو نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک ایسا حسین جرم ہے جس میں کسٹم کے ہزار ہا ہزار قوانین بار بار توڑنے کو جی چاہتا ہے۔ ایسی سیکڑوں مثالیں ہمارے آس پاس بکھری پڑی ہیں۔

ہم دوبارہ نفسِ مضمون کی طرف لوٹ آتے ہیں :

جس حادثے کی ورقہ بن نوفل نے نشاندہی کی تھی آخر وہ واقعہ نبوّت کے تیرھویں سال پیش آ ہی گیا۔ اس وقت تک ورقہ بن نوفل بھی وفات پا چکے تھے، جب کفارِ قریش نے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ مسلمانوں کی جان پر بن آئی تھی۔ ابو جہل کی اقتداء میں وہ ایک رات آنحضرتؑ کا کام تمام ہی کرنے والے تھے کہ اشارۂ غیبی پا کر آپؑ نے ہجرت کا تہیہ کر لیا اور جب مکّے سے نکل کر مدینے کو روانہ ہونے والے تھے تو آپؑ نے اپنے وطن کو خطاب کر کے فرمایا:

''خدا کی قسم اگر چہ میں تجھ سے رخصت ہو رہا ہوں، مگر میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو سب شہروں میں عزیز اور محبوب شہر ہے اور اگر تیرے باشندے مجھے تجھ سے جدا نہ کرتے تو میں ہرگز تجھے نہ چھوڑتا۔'' ایک روایت میں ہے کہ آنحضرتؑ نے خروزہ کے مقام پر اپنی سواری کو ٹھہرایا اور بیت اللہ کی طرف دیکھ کر فرمایا، ''خدا کی قسم! اللہ کی زمین میں تو میرے لیے محبوب ترین جگہ ہے اور اللہ کے نزدیک بھی تو اس کی زمینوں میں محبوب ترین جگہ ہے۔ اگر تیرے باشندے زبردستی مجھے نکلنے پر مجبور نہ کرتے تو میں تجھے چھوڑ کر نہ جاتا۔''

اُمّ السّیر، سیرتِ حلبیہ میں مرتب نے سخاوی کی کتاب ''جمال القراء'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''جب آنحضرتؑ مکّے سے ہجرت کر کے مدینہ کو روانہ ہونے لگے تو

رک کر آپؐ نے مکّے پر نگاہ ڈالی اور رو پڑے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی
وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ هِىَ اَشَدُّ قُوَّةً...... الخ ۱۱۳ (سورہ محمدؐ:۲)
(ترجمہ: اور بہت سی بستیاں ایسی تھیں جو قوت میں آپ کی اس بستی سے بڑھی ہوئی تھیں۔
جس کے رہنے والوں نے آپ کو گھر سے بے گھر کردیا کہ ہم نے ان کو ہلاک کردیا سواُن کا
کوئی مددگار نہ ہوا۔)

یہاں تک ہم نے ''تصوّرِ وطن'' کا صرف ایک پہلو یعنی جذباتی اور وہ بھی نبوی رُخ پیش کیا ہے۔ بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اقبال کے تصوّرِ وطن کی بالیدگی کو پانے اور محسوس کرنے کے لیے ابھی ہمیں اور منزلیں طے کرنی پڑیں گی۔ اگر اقبال شاعرِ اسلام تھے جیسا کہ ان پر بعض متعصّبین اور رجعت پسندوں نے یہ لیبل چسپاں کر ہی دیا ہے تو پھر ہمیں بھی یہ ثابت کرنے دیجیے کہ آنحضرتؐ کا یہ پورا عمل جسے آپ اوپر پڑھ چکے ہیں، کسی اسلامی شعائر میں فرض، واجب، سنّت فرضِ کفایہ، یہاں تک کہ مستحبات میں بھی داخل نہیں کیا گیا ہے۔ آپؐ کا یہ پورا کا پورا عمل سو فیصد سیکولر اور انفرادی ہے۔ آپ اگر وطن پرستی کی بجائے وطن سے محبت کرتے ہیں تو اسلام کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے............وطن کی محبت کے تعلق سے ابھی اور سخت مرحلے باقی ہیں۔ آیئے دیکھتے چلیں۔

ہجرت کے بعد نبی آخرالزماںؐ نے صرف چار مرتبہ مکّے کا رخ کیا، جن میں سے صرف تین مرتبہ آپؐ وہاں تک تشریف لے جاسکے۔ پہلی مرتبہ آپ کو پورے کاروانِ صحابہؓ کے ہمراہ حدیبیہ سے ہی لوٹنا پڑا تھا وجہ اس کی یہ تھی کہ قریشِ مکّہ نے آپؐ کو مکّے میں داخل ہونے کی اجازت ہی نہیں دی، اور یہ شرط لگادی کہ آپؐ اگلے سال ہی تشریف لائیں گے۔ صحابہ کرامؓ کے دل میں اپنے وطن کے دیدار کی تمنا انگڑائیاں لے رہی تھی اور اس کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھے۔ لیکن قائد کے حکم کے آگے اپنی ہر چیز کو قربان کرنا پڑا۔ اگلے

سال ۷۰ھ میں یہ عُمرہ قضا کیا گیا۔ آنحضرتؐ نے صرف تین دن کے لیے اپنی محبوب سرزمین پر قیام فرمایا۔ اسی دوران آپؐ نے حضرت میمونہؓ سے نکاح فرمایا۔ دعوتِ ولیمہ کا اہتمام کیا۔ سارے قبیلۂ قریش کو مدعو کیا، لیکن کھانے میں کوئی شریک نہیں ہوا۔ آپؐ اپنی پوری جمعیت کے ساتھ مدینۂ منورہ لوٹ آئے۔

مکّہ مکرمہ میں نبی کریمؐ کا سب سے اہم داخلہ ۸۰ھ میں واقع ہوا جب فتحِ مکّہ کے موقع پر ایک فاتح کی حیثیت سے آپؐ اپنے اس وطن میں داخل ہوئے۔ اس وقت کرۂ ارض پر کوئی ایسی طاقت موجود نہیں تھی جو آپؐ کو اپنے وطن میں قیام سے روک سکتی تھی، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ آپؐ نے وہاں قیام نہیں فرمایا اور ضروری انتظامات کے بعد دوبارہ مدینہ منورہ لوٹ آئے۔ آپؐ سلطنت کے مطالبات اور انتظام کے واجبات مکّے میں قیام کر کے بھی پورے کر سکتے تھے اور کسی کو مطلق اعتراض بھی نہ ہوتا لیکن ملّت کے عظیم مفاد کی خاطر آپؐ نے لوٹنے کو ہی ترجیح دی اور کسی صورت میں بھی وطن کی محبت کو دامن گیر نہیں ہونے دیا۔

وطن سے ہجرت کرنا، فاتح کی حیثیت سے داخل ہونا اور انسانی فلاح کے ایک عظیم مقصد کی خاطر واپس لوٹ آنا، انسانی تاریخ میں ایک ایسا واقعہ ہے جو مدنی ترقیات، آبادیوں کی نقل و حرکت اور اصولوں کی قربان گاہ پر اپنے جذبات کو بھینٹ چڑھا دینا، یقیناً انسانی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ اس واقعے سے شریعت و اطاعت کے مسائل کی گتھیاں سلجھتی ہیں اور اعلیٰ مقاصد کے سامنے محض جذبات کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی۔ یہی شانِ نبوّت ہے۔ فکر کی اسی بلندی نے پورے کرۂ ارض کو انسانوں کا صرف مسکن ہی نہیں بلکہ وطن بنا دیا ہے اور سارے انسانوں کو بھائی بھائی بنا دیا ہے۔ اب پڑھیے وطن کے تعلق سے اقبالؔ کے وہ سارے اشعار جو اُن کے کلام میں ملکوں کی سرحدوں کو ڈھاتے ہیں اور دور دراز ملکوں میں بسنے والے انسانوں کو ایک کنبہ بنا دیتے ہیں۔ یہی وہ شعائر ہیں جہاں

سے اقبال نے اپنے وطن کی تعمیر کے لیے خام مال فراہم کیا تھا۔

کلام اللہ سے ایسی لاتعداد آیات اور کتبِ احادیث سے ایسی متعدد حدیثیں نقل کی جاسکتی ہیں جن سے ملتِ آدم کا ایک انوکھا تصوّر عالمِ انسانیت کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے۔ بر دست صرف ایک آیت کا ترجمہ پیش کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے تاکہ قارئین اقبال کے تصوّرِ وطن کی تہہ تک پہنچ سکیں :

یا ایھا الناس انا خلقنکم من ذکروانثاء و جعلنکم شعو با و قبائل لتعارفوان اکرمکم عنداللّٰہ اتقکم ان اللہ علیم خبیرo

''اے لوگو! ہم نے تم کو (ایک جوڑے) مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمھیں قوموں اور قبیلوں کی صورت دی، تا کہ تم پہچانے جاؤ۔ حقیقتاً اللہ کی نگاہ میں معزز ترین وہی ہے جو متقی (پرہیزگار) ہو۔ بیشک اللہ علیم اور ہر بات سے باخبر ہے۔''

(الحجرات۔۴۹:۱۴)

اب علّامہ کے صرف اردو کلام سے بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ ۲۰ رویں صدی میں مغرب کی چند استعماری طاقتوں کے ذریعے پیدا کردہ ''وطن کے نام نہاد ہیولے'' کو اقبال نے کس پاتال میں پہنچایا ہے:

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوّت میں وطن اور ہی کچھ ہے

بُتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملّت میں گُم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب کا نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا
بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

تفریقِ ملل، حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملّتِ آدم

وطن کے اس آفاقی تصوّر کو اگر ہم ہجرت کے تناظر میں دیکھیں اور یہ تصوّر کر لیں کہ آنحضرتؐ کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہونے کے باوجود آپؐ مدینہ منوّرہ تشریف نہیں لے جاتے اور وہیں مکّے میں آباد ہو جاتے یا بفرضِ محال ہجرت ہی نہیں فرماتے تو کیا ہوتا؟

۱۔ رہتی دنیا تک یہ بات مشہور ہو جاتی کہ آپؐ نے محض مکّے کے اقتدار سے سردارانِ قریش کو بے دخل کرنے کے لیے یہ تحریک چلائی تھی یا جنگیں لڑی تھیں۔ جب اقتدار حاصل ہو گیا تو آپؐ وہیں آباد ہو گئے۔

۲۔ آپؐ اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور ماننے والوں کو ظالموں کے پنجے سے نجات دلانا چاہتے تھے، عام مظلوم انسانیت سے آپؐ کو کچھ لینا دینا نہ تھا، جیسا کہ ملکوں کو

آزادی دلوانے والے سورماؤں کا معاملہ رہا ہے۔

۳۔ آپؐ کی مقبولیت اور محبوبیت کے نتیجے میں بہت بڑی انسانی آبادی مکّے میں سمٹ آتی اور مکّے کے اصلی باشندے اقلیت میں چلے جاتے۔ جس کے نتیجے میں مکّی عربی تہذیب، ثقافت، زبان اور روایات (Ethos) کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جاتا۔

۴۔ اگر بفرضِ محال آپؐ ہجرت ہی نہیں کرتے تو دیگر مذاہب کی طرح دینِ اسلام بھی ایک مقامی اور علاقائی مذہب بن کر رہ جاتا اور چار دانگِ عالم میں اس کا ڈنکا بج نہیں پاتا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ جو صحابہ کرامؓ مکّی زندگی میں حبشہ وغیرہ ہجرت کر گئے تھے اور ان کی وجہ سے اسلام کا جو تعارف دیگر ملکوں میں ہو رہا تھا وہ بھی رک جاتا۔

۵۔ مکّے کو اگر سیاسی مرکزیت حاصل ہو جاتی تو یہ مقام آئے دن کی جنگوں، یلغار اور سیاسی ریشہ دوانیوں کا مرکز بن جاتا اور کعبے کی تقدیس و حرمت کو بچانا آپؐ کو بھی اور آنے والی نسلوں کے لیے بھی مشکل ہو جاتا۔

۶۔ ہجری کلنڈر وجود میں ہی نہیں آتا اور نَسی (مرضی کے مطابق مہینوں کو آگے پیچھے کر دینے والا) جاہلانہ اور ظالمانہ قانون جاری رہتا۔ ہجری کلنڈر نے تاریخ کی روایتوں، جغرافیائی حد بندیوں، تہذیبی فرقہ پرستیوں کو توڑ کر انسانی یگانگت کو جنم دیا ہے جو اپنے آپ میں ایک مستقل تصنیف کا متقاضی ہے۔

یہ اور ایسی متعدّد وجوہات ہیں جن کی بناء پر نبی آخر الزماںؐ نے ہجرت فرمائی اور اپنے وطن سے انتہائی جذباتی لگاؤ ہونے ...... اور ...... اقتدارِ اعلیٰ کے حصول کے باوجود مدینہ منوّرہ جانا ضروری گردانا۔ اس سے ایک طرف تو یہ کہ مدینے والوں کو تقویت ملی، نتیجے میں ان کی تقویت سے اسلام کو فائدہ پہنچا اور دوسرے یہ کہ اسلام ارضی اوطان کی قید سے آزاد ہو کر آفاقی بلکہ انسانی بن گیا۔ آج پوزیشن یہ ہے کہ انسان اگر چاند اور مریخ پر بھی جائے تو اسلام

اس کی ضرورت اور مسلمانوں کا وجود اس کے لیے باعثِ اہمیت ہے۔ یہاں اقبالؔ نے جو ''قومیتِ اسلام'' کا ایک آدھ جگہ لفظ استعمال کیا ہے، وہ اقبالؔ کی مجبوری ہے۔ کیونکہ انسانیت کے اس عظیم تر مفاد کی بالکل سیکولر بنیادوں پر وضاحت اسلام سے پہلے کسی مذہب نے نہیں پیش کی تھی۔ دراصل یہاں اسلام ایک علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے، نہ کہ عقیدے اور عقیدت کے طور پر۔ آیئے ''تصورِ وطن'' کا مزید تجزیہ کریں۔

(ب) وطن کا سیاسی تصوّر

عالمِ انسانیت کے رابطے کی تاریخ میں شاید وہ سب سے نامبارک دن تھا جب انگلستان نے ۱۸۵۸ء میں پہلا پاسپورٹ جاری کیا۔[۱] پاسپورٹ اور ویزا کے اجراء نے انسانوں کو سرحدوں کی حد بندیوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا۔ صرف انسان ہی نہیں بٹا بلکہ تعلیم، تہذیب، ثقافت، زبان غرض سب کچھ بٹ کر رہ گیا۔ پہلے قومیت کے نام پر ملک بٹے۔ دیواریں اونچی ہوتی چلی گئیں، یہاں تک کہ زبان اور تحریکوں (اِزم) کے نام پر بھی ممالک بٹتے چلے گئے۔ مشرقی جرمنی کو مغربی جرمنی سے صرف اس لیے الگ کر دیا گیا کہ مشرقی جرمنی (FGR= فیڈرل جرمن رِپبلک) نے کمیونزم کو اختیار کر لیا تھا۔ حالانکہ جرمن ایک ہی قوم تھی۔ عسکری اور صنعتی طاقتوں کو بٹورنے کی مہم شروع ہوگئی اور اسی کے نتیجے میں پہلی اور دوسری جنگِ عظیم واقع ہوئی جس میں بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور ذرا سی بات پر ممالک ایک دوسرے سے ٹوٹ کر الگ ہوتے ہیں اور دنیا کے نقشے پر نوزائیدہ ملکوں کو الگ رنگ کی سیاہی سے پوتنا پڑتا ہے۔ اپنے وطن کو طاقتور بنانے کی دوڑ میں پڑوسی ملکوں کا استحصال آج بھی جاری ہے اور اس جنون میں سب سے زیادہ مشرقی اور بطورِ خاص ایشیائی ممالک کو نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ اکیلے یورپ میں

[۱] اس وقت پاسپورٹ کی اوّلین شکل 'پروانۂ راہداری' کے ورق سے زیادہ کی نہ تھی۔

صرف لسانی بنیادوں پر دو درجن سے زیادہ چھوٹے چھوٹے ممالک وجود میں آچکے ہیں۔ بعض ممالک اتنے چھوٹے ہیں کہ کسی ملک سے جب کوئی ہوائی جہاز اڑان بھرتا ہے تو فضا میں بلند ہونے سے پہلے پہلے وہ دوسرے ملک کی سرحدوں سے آگے نکل چکا ہوتا ہے۔ ہر ملک کی زبان الگ، معاشی نظام الگ، کرنسی الگ، قوانین الگ۔ یورپ والوں نے تو خیر متحد ہو کر اپنی کرنسی ایک کر لی ہے اور وہاں کے کسی بھی ملک میں اب یورو (Euro) ڈالر چلتا ہے، لیکن مشرقی ملکوں کا حال برا ہے۔ یہ چاہتے ہوئے بھی ایک نہیں ہو سکتے کیونکہ ہر ایک کے مفادات جُدا ہیں اور وہ کسی نہ کسی مغربی ملک سے وابستہ ہیں۔

اقبالؔ کے لیے یہ بہت آسان تھا کہ وہ اپنے دور میں جاری وطنیت کے تصوّر کو ہی سکۂ رائج الوقت کی طرح آگے بڑھاتے اور وطن کی محبت کے جذباتی تصوّر کو ہی فکری رنگ دیتے جیسے ان کے کلام میں ہمالہ، ہندوستانی بچّوں کا قومی گیت اور ترانۂ ہندی جیسی نظمیں ملتی ہیں۔ ’’نیا شوالہ‘‘ نامی نظم میں ’’خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے‘‘ جیسے ایک مصرعے سے صَرفِ نظر، یہ پوری نظم میثاقِ مدینہ اور لَکُمْ دِینُکُم وَلِیَدِیْنَ ۝ کی عمدہ تفسیر ہے اور اسلامی پیغامِ اخوت کا ایک نمونہ ہے۔

وطن کے اسی محدود تصوّر نے کشمیر، ناگالینڈ، میزروم، تبّت، شمالی جنوبی کوریا، شمالی جنوبی یمن، کیوبا اور فلسطین جیسے مسائل پیدا کر رکھے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق عالمی عدالت (World Court) میں ساڑھے تین سو سے زیادہ مقدمات محض بین الملکی سرحدی تنازعات کے معلّق (Pending) ہیں، جبکہ ساری دنیا میں اتنی تعداد میں ممالک بھی نہیں ہیں۔ وطن کے اسی محدود سیاسی تصوّر نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد جمعیتِ اقوام (League of Nations) کو جنم دیا تھا۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے ناکام ہوگئی۔ کلامِ اقبالؔ میں اس کی ناکامی کی پیشین گوئی دکھائی دیتی ہے۔

اقبال کے تصوّرِ وطن کو مزید واضح کرنے کے لیے '' ضربِ کلیم '' کی سلسلہ وار تین نظمیں پیش کی جاتی ہیں۔ ان سے قارئین کو اس سیاسی تصوّر کی ناکامی اور کمزور قوموں پر حریص و طاقتور ملکوں کی یلغار کا اندازہ ہو سکے گا:

جمعیتِ اقوام

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبرِ بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مُبرَم نظر آتی ہے و لیکن
پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

(ضربِ کلیم)

شام و فلسطین

رندانِ فرانسیس کا میخانہ سلامت
پُر ہے مَے گلرنگ سے ہر شیشہ حلب کا
ہے خاکِ فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا؟
مقصد ہے ملوکیتِ انگلیس کا کچھ اور
قصہ نہیں نارنج کا یا شہد و رُطب کا!

(ضربِ کلیم)

سیاسی پیشوا

امید کیا ہے سیاست کے پیشواؤں سے
یہ خاکباز ہیں رکھتے ہیں خاک سے پیوند!
ہمیشہ مور[6] و مگس[7] پر نگاہ ہے ان کی
جہاں میں ہے صفتِ عنکبوت ان کی کمند[8] !
خوشا وہ قافلہ، جس کے امیر کی ہے متاع
تخیّلِ ملکوتی و جذبہ ہائے بلند!

(ضربِ کلیمؔ)

دورِ حاضر میں دنیا کے سارے بڑے اور استعماری ممالک Security کے نام پر یہ عمل رَوا رکھے ہوئے ہیں، گویا جینے کا حق صرف انھیں کو ہے۔ اسی محدود وطنیت کے تصوّر نے بم کلچر، دہشت پسندی، ہلاکت آفرینی، یرغمالیت، سیاست، قتل، بے چینی، عدم اعتمادی، غیر یقینی صورتحال، عدمِ تحفظ اور عدمِ استحکام جیسے فتنوں کو جنم دیا۔ معصوموں کی جانوں کے ضیاع کے نتیجے میں معصوم افراد گرفتار ہوئے جن پر اذیتوں کے پہاڑ توڑے گئے اور معاملہ آج تک حل نہ ہوسکا۔ کاش کہ معصومانِ یورپ وطن کے اس سیاسی تصوّر پر نظر ثانی کرتے کیونکہ

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

(ج) وطن کا فقہی تصوّر

ہمارا دعویٰ ہے کہ آج تک وطن کے تصوّر کو فقہی تناظر میں لاکر سوچا ہی نہیں گیا ہے کہ یہ بھی ایک شرعی پہلو ہے۔ اسے بھی مختصراً ہی کیوں نہ سہی، لیکن سمجھنے کی ضرورت ہے۔

---

1 جس کے نتیجے کی خبر ہو، فدنی، اٹل 2 ملک شام کا مشہور شہر 3 بادشاہت 4 نارنگی، سنترہ، مراد اسرائیل
5 نیم پختہ کھجور، مراد ممالک عربیہ 6 چیونٹی 7 مکھی 8 جال، مراد کمزور عوام کو اپنے جال میں پھانسنا

عام طور پر یوں بھی ہوتا ہے کہ انسان کسی مقام پر پیدا ہوتا ہے۔ ابتدائی چند گھڑیاں وہاں کی گلیوں میں گذارتا ہے اور پیشے یا کاروبار کے نتیجے میں کسی اور شہر کو ہجرت کر جاتا ہے یا مستقل سکونت اختیار کر لیتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا اس پر اپنے وطن کا حق نہیں ہے۔ سوائے عرب ملکوں کے، قومیت عطا کرنے کے معاملے میں تو مغربی ممالک، بلکہ بعض مشرقی ممالک بھی بڑے فراخدل واقع ہوئے ہیں۔ اپنے ملک کی سرزمین پر پیدا ہونے والے بیرونی ملک کے والدین کے ہر اُس بچے کو قانوناً وہاں کی شہریت (Nationality) عطا کی جاتی ہے۔ صرف اسپتال یا گھر میں ہی پیدا ہونے پر محمول نہیں بلکہ، اس ملک کے آبی جہاز، ریل، ہوائی جہاز، موٹر، بس، یہاں تک کہ کسی دوسرے ملک یا کمپنی سے اگر یہ چیزیں کرائے پر لی گئی ہوں اور دورانِ سفر اگر بچّے کی پیدائش ہو جائے تب بھی طلب کرنے پر اس بچے کو اس ملک کی شہریت بحال کی جاتی ہے۔

ہم نے یہ تفصیل اس لیے باندھی ہے کہ اگر کسی شخص کو معلوم ہے کہ اس کا مقامِ پیدائش کیا ہے اور اگر وہ برسوں گذر جانے کے بعد بھی وہاں پہنچتا ہے اور اس کی نیت اگر وہاں مختصر قیام کی بھی ہے اور اگر اسے وہاں فرض نماز ادا کرنی ہے تو اسے وہاں پوری نماز پڑھنی ہوگی نہ کہ وہ اپنی نماز قصر کرلے گا۔ ہم نے خود بڑے علماء اور فقہاء کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔

ظاہر ہے کہ علماء کوئی کام بغیر سند کے نہیں کرتے۔ ممکن ہے اس کی سند انھیں اسوۂ رسولؐ میں ملی ہو۔ یعنی جب آنحضرتؐ ہجرت کے بعد مکۂ مکرمہ تشریف لے گئے اور آپؐ نے فرض نمازوں کی امامت کی تو بجائے فرض نمازیں قصر کرنے کے آپؐ نے پوری نمازیں ادا کی ہوں گی۔ ایک مومن کے عمل کے لیے اتنی ہی نظیر کافی ہے۔ وجوہات کا ہمیں علم نہیں۔

اب اس پورے تناظر میں آپ ڈاکٹر علامہ اقبال کے تصورِ وطن کو دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ وہ اسلام سے قریب ہے، یعنی انسانیت سے قریب ہے۔ دوسرے کسی مذہب میں اتنا

مفصّل تصوّرِ وطن پایا ہی نہیں جاتا۔ دیگر امتوں نے بھی ہجرت کی ہے لیکن ان کی ہجرت عارضی اور ایک متعیّنہ میعاد کے لیے تھی۔ جیسے ہی حالات سازگار ہوئے انھوں نے اپنے پیدائشی ٹھکانوں کی طرف کوچ کر دیا۔ لیکن اس کے برعکس آنحضرتؐ نے ہجرت کے عمل کو عارضی نہیں رکھا، بلکہ امّت کے لیے اس کو دائمی اور مستقل بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام صرف مکّے اور مدینے یا حجاز کی حد تک نہیں رہا بلکہ اقصائے عالم میں پھیل گیا، کیونکہ صحابہ کرامؓ اور مبلّغین اور داعیوں کے سامنے اپنے نبی آخرالزماں کی نظیر تھی کہ جب سرکارِ دو عالمؐ اشاعتِ دین کی خاطر اپنے وطن کو خیر باد کہہ سکتے ہیں تو پھر ہماری کیا حیثیت ہے؟ چنانچہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ صحابہ کرامؓ جب حجازِ مقدّس سے نکلے تو انھوں نے اجنبی زمینوں، نامانوس پانیوں اور بلند و بالا پہاڑوں تک کو رَوند ڈالا۔ نئی نئی زبانیں سیکھیں اور اس میں اسلام کو پیش کیا۔ وہیں رہ بس گئے۔ رشتہ داریاں قائم کیں اور وہیں وصال پایا۔ آج اُن کی قبروں تک کا پتہ نہیں ہے کہ کون کہاں دفن ہوا ؎

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا

کی حق سے فرشتوں نے اقبالؔ کی غمّازی
گستاخ ہے کرتا ہے، فطرت کی حنا بندی!
خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی
رومی ہے، نہ شامی ہے، کاشی، نہ سمرقندی!
سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اِس نے
آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی!

(بالِ جبریل)

ما حصل یہ کہ وطن کی اسی محدود تصوّر نے لارنس آف عربیہ (Lawrance of Arabia) کو جنم دیا۔ اسی نے ترکستان سے خلافت کا خاتمہ کیا۔ اسی تصوّر کے تحت ہر ملک میں آزادی کی تحریک اٹھی اور وطنی (Native) کی حکمرانی کا غلغلہ بلند ہوا۔ مختلف اسلامی ملکوں میں سخت گیر سیاسی پارٹیاں وجود میں آئیں اور جو لوگ اسلام کے آفاقی نظام (Pan Islamism) کو مانتے تھے اور اسلامی حکمرانی کے غلبے کی بات کرتے تھے انھیں نہایت بے دردی سے ٹھکانے لگا دیا گیا۔

یاسر عرفات، حافظ الاسد، جمال عبدالناصر وغیرہ اسی محدود وطنیت کی مثالیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ اخوان المسلمون کی ناکامی کی بہت ساری وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انھیں عوام کی وہ حمایت حاصل نہیں ہو پائی جس کے وہ مستحق تھے اور عوام کی حمایت اس لیے انھیں حاصل نہیں ہو پائی کیونکہ ان کے ذہن میں یہ تصوّر بھی کسی حد تک موجود تھا کہ فراعنہ مصر کے تقریباً ساڑھے تین ہزار سال بعد جمال عبدالناصر پہلا مصری نژاد حکمراں تھا جس نے مصر کی زمامِ قیادت سنبھالی تھی۔ ورنہ اب تک جتنے بھی حکمراں آئے تھے، بقول مصریوں کے وہ سب کے سب بیرونی ملکوں کے باشندے تھے اور انھیں مصری عوام سے کچھ لینا دینا نہ تھا۔ تمام چھوٹے بڑے ملکوں میں وطنی حکمرانوں اور علاقائی پارٹیوں کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ وطنیت کا یہ محدود تصوّر بھی ہے۔

امریکہ کے محلِ وقوع اور قیام کے بعد یہ امید بندھ چلی تھی کہ عظیم آفاقی اور انسانی بنیادوں پر اب دنیا کی از سرِ نو ترتیب اور تزئین ہوگی، کیونکہ امریکہ میں کوئی شخص خالصتاً امریکی نہیں ہے۔ جو اصل امریکی ریڈ انڈین ہیں وہ کب کے ختم کردیئے گئے۔ آج ان کی نسل کی بقاء کے لالے پڑے ہوئے ہیں .... لیکن بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ امریکی باشندوں نے جو دراصل یورپ اور دیگر ایشیائی ممالک کے مہاجرین ہیں، اپنے

اطراف وطنیت اور قومیت کی ایسی سخت دیوار کھینچی ہے کہ مستقبل قریب میں اس کا ڈھانا مشکل نظر آتا ہے۔ چھوٹی قوموں اور نسلی اکائیوں کی تحدیدات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ ان کے لڑکے تو ابھی ٹینکوں اور توپوں کے مقابلے میں ہاتھوں میں پتھر سنبھالے ہوئے ہیں

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا
(غالبؔ)

□□□

با آن رازی کہ گفتم پی نبردند
ز شاخِ نخلِ من خرما نخوردند
من ای میرِ امم داد از تو خواہم
مرا یاران غزلخوانی شمردند
اقبال

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟
نسیمی از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگاری این فقیری
دگر دانائے راز آید کہ ناید؟
اقبال

وہ رباعیات جو علامہ اقبال کے آخری وقت میں ان کے وردِ زبان تھیں۔

خدا کے حضور اقبالؔ کے منظوم مراسلے

خطوط نگاری بھی ایک عجیب وغریب صنف ہے۔ لیکن یہ فن نہیں کہلایا جاسکتا۔فن ایک مسلسل تدوینی اور تکوینی عمل کا نام ہے۔فن کے اصول باقاعدہ وضع ہوتے ہیں اور اس کے حواشی اور زوائد قطع ہوتے رہتے ہیں۔لیکن خطوط، فرازِ کوہ سے اترنے والے اس چشمۂ عارضی کے مثل ہیں جو کسی پہاڑی جھیل کے لبریز ہونے کے بعد چھلک اٹھتا ہے۔جس میں اُبال بھی ہے اور جوش بھی، گرم روی بھی ہے اور خرامِ ناز بھی۔اس میں سرگوشیاں بھی ہیں اور شورش بھی اور اپنے بہاؤ کے رخ پر زمانے کے رخ کو پھیر دینے کی صلاحیت اور کوشش بھی ہے۔خطوط کو مضامین کی اُفتاد اور کیفیت کے مطابق آپ مختلف خانوں میں تقسیم کرسکتے ہیں لیکن شاید آپ خطوط پر اچھا یا بُرا ہونے کی قدغن نہیں لگا سکتے۔خطوط صرف اچھے ہی ہوتے ہیں۔اُن میں رازداری کی بالکل وہ کیفیت ہوتی ہے جو دعاؤں میں بندے اور مولا کے درمیان ہوتی ہے۔اگر خط کی زبان اچھی یا بری ہے یا اس میں کوئی اور خوبی یا جھول ہے تو آپ کو اس سے کچھ لینا دینا نہیں۔وہ کاتب اور مکتوب الیہ کے درمیان کی بات ہے، اسے وہ جانیں۔بقول ڈاکٹر خورشید الاسلام ''دنیا کے بہترین خطوط عورتوں کے لکھے ہوئے ہیں۔'' ضروری نہیں کہ ہر خط میں ہٹلر، ہٹلر ہی نظر آئے۔ہٹلر کے نجی خطوط پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ہٹلر میں نسوانیت بھی تھی اور وہ بھی ایسی ویسی نہیں، بے چارگی کی حد تک پہنچی ہوئی۔ ضروری نہیں کہ ہر خط ڈاک کے حوالے کیا جائے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ منثور ہو۔اگر اکبرالہٰ آبادی، عشرت کو لندن کے پتے پر نظم میں خط لکھ سکتے تھے تو پھر بھلا اقبالؔ کو جاوید کے

نام منظوم خطوط لکھنے سے کون روک سکتا تھا۔اور پھر اقبالؔ تو اقبالؔ تھے۔انھوں نے اس سے ذرا اور آگے بڑھ کر اپنے معروضات تحریری شکل میں سرورِ کائنات کی خدمت میں پیش کیے ہیں۔سرزمینِ حجاز کے نام لکھے ہیں اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے اپنے مراسلے خدائے ربّ کائنات کے حضور بھی پیش کیے ہیں۔

آپ شاید میری اس بات کی توثیق نہ کریں کہ خدا کے نام یہ اقبالؔ کے خطوط کب ہیں؟ تو عرض ہے کہ یہ کب ضروری ہے کہ بندہ خدا سے صرف دعاؤں اور مناجات کی راہ سے ہی بات کرے کیونکہ ہم اقبالؔ کے جس کلام کی طرف آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہتے ہیں وہ ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنّا میری - زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری'' یا پھر ''یارب! دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنّا دے - جو قلب کو گرما دے اور روح کو تڑپا دے'' والی کیفیت سے یکسر خالی ہے۔خط جھنجھلاہٹ، شکایت، گذارش، تحکیم، تحدید، تعذیر، تعذیب، بے چارگی، لاچاری، شکست، غلبے اور متعدّد کیفیات کا مجموعہ ہوتا ہے اور کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ خط مجموعی طور پر آہ و بکا، نالہ و فریاد اور شکوہ و شیون کا دفتر بن جاتا ہے۔اقبالؔ چونکہ فرشتوں کو آدم کی تڑپ اور آدم کو آدابِ خداوندی سکھانے کے قائل تھے اس لیے انھوں نے اپنے مراسلوں کی ترسیل کے لیے نہ صرف یہ کہ زبان و قلم کا سہارا لیا بلکہ اس کے لیے انھوں نے خضرؑ، حضرت جبرئیلؑ، یہاں تک کہ اس پیغام رسانی کے لیے بادِ صبا اور ابلیس سے بھی کام لیا ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ اقبالؔ کا یہ عمل تجاہلِ عارفانہ سے کم نہیں۔خدا کے حضور لکھے گئے خطوط میں اقبالؔ کبھی تو شاکی ہیں، کبھی ناراض و نامراد اور کبھی محاذ آراء۔ان کے کلام میں اس ضمن میں جو بے ساختگی اور زبردست آمد پائی جاتی ہے اور اس عمل کے لیے انھوں نے جس آہنگ کو برتا ہے وہ خاصے کی چیز ہے۔خدا کے حضور ان کا معروضہ پہنچتا بھی ہے۔فرشتے

اس کی پیشکش کی سفارش بھی کرتے ہیں اور پھر حسبِ معمول خدا کا جواب بھی آتا ہے۔ نامہ و پیام کا یہ سلسلہ اقبال کے پورے کلام میں موجِ مضطر کی طرح جاری ہے لیکن یہ اپنے شباب پر' شکوہ' اور 'جوابِ شکوہ' میں نظر آتا ہے۔

اقبال خودی سے سرشار تھے۔ اپنی گستاخی و بے باکی سے وہ خود خائف رہتے تھے۔ اُن کی زندگی میں، اُن کے اسی عمل پر اُن کے خلاف کفر کا فتویٰ بھی جاری ہوا۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے بے باکی کا یہ عمل ترک نہیں کیا۔ جہاں وہ خدا کے حضور سمندر سے پیاسے کو محض شبنم ملنے کی شکایت کرتے ہیں وہیں یہ بھی کہہ گزرتے ہیں کہ ؎

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا؟
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب! لامکاں تیرا ہے یا میرا؟

صرف اسی پر بس نہیں بلکہ خدا اور ابلیس کے درمیان ایک اَن دیکھے سمجھوتے کو وہ بے نقاب کرتے ہیں۔

اُسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیوں کر
مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟

اور پھر آگے اس چیلنج کو ملاحظہ فرمائیں ؎

محمدؐ بھی ترا، جبرئیل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

بالِ جبریل کی اکثر غزلیات پڑھ کر بالکل یوں محسوس ہوتا ہے کہ بندہ خالق کے سامنے محاذ آراء ہے۔

یہ مشتِ خاک، یہ صرصر، یہ وسعتِ افلاک
کرم ہے یا کہ ستم، تیری لذتِ ایجاد
قصوروار، غریب الدّیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کرسکے آباد

اور پھر یہ شعر بطورِ خاص ملاحظہ فرمائیں۔

مقامِ شوق ترے قُدسیوں کے بس کا نہیں
انھیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

اپنی اس گستاخی پر وہ نادم نہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ مکتوب الیہ کی خدمت میں اپنا استغاثہ پیش نہیں کر رہے ہیں بلکہ اللہ میاں کو وجہ بتاؤ (Show Cause Notice) جاری کر رہے ہیں۔ نامے کے اخیر میں اپنی مُہرِ ندامت یوں ثبت کرتے ہیں۔

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبالؔ
کرتا کوئی اِس بندۂ گستاخ کا منہ بند

اقبالؔ سے خدا کا تعلق دوستانہ ہے۔ وہ حریمِ ذات بھی ہے اور محرمِ راز بھی۔ اقبالؔ کا استغاثہ ''شکوہ'' میں اپنے شباب پر ہے۔ اس نظم کا انداز ایک مفصّل خط کی پوری پوری کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ کاتب اور مکتوب الیہ کا نام اور پتہ، سرنامہ، اپنی حیثیتِ عرفی اور اس کے متن کی کیفیت بالکل ایسی ہے جیسے کوئی ملازم اپنے ایسے آقا کے سامنے اپنی خدمات کا رپورتاژ پیش کر رہا ہے جو اپنے ملازم کی خدمات کا اعتراف نہیں کرتا۔ ادب ولحاظ کا دامن تھامے آقا کے حضور اپنی فردِ شکایت ایسے پُراثر اور رِقت آمیز سج دھج کے ساتھ پیش

کی گئی ہے کہ آقا کی بے نیازی بھی اپنی روایتی خاموشی اور دل کو ہلا دینے والی شانِ جلال و جبروت کو بالائے طاق رکھ، زمینِ آدم پر قدم دھر دیتی ہے اور ہر ہر شکوے کا مُسکت جواب دے کر شاکی کو قائل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مثلاً اقبال کی یہ جرح کہ :

تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذاتِ قدیم پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرط انصاف ہے اے صاحبِ الطافِ عمیم بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم؟

ہم کو جمعیّتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ امت ترے محبوبؐ کی دیوانی تھی؟

یہاں اقبال اسی بات پر زور دیتے ہیں کہ یہ ملّت ہی تھی جس نے تکلیفیں سہہ کر خدا اور رسولؐ کے نام کی عظمت کو قائم کیا اور عقائد کی بنیادوں کو مستحکم کیا، اس کا جواب عرشِ اعظم سے یہ آتا ہے :

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں راہ دکھلائیں کسے؟ رہروِ منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے، جوہرِ قابل ہی نہیں جس سے تعمیر ہو آدم کی، یہ وہ گل ہی نہیں

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اقبال کا منشاء خدا سے محاذ آرائی نہ تھا بلکہ دراصل اس پورے محاکاتی عمل سے انھیں اپنی بات اپنے ہم عصروں اور بعد کو آنے والی نسلوں تک پہنچانی تھی۔ اقبال کا اسلوب چونکا دینے والا ہے۔ خدا کے آفاقی قانون کو وہ اکثر اپنی نظموں میں سوال وجواب کے واسطے (माध्यम) سے پیش کرتے ہیں۔ پھر چاہے وہ مکالمہ چاند اور تاروں کے بیچ ہو یا شمع وشاعر کے مابین یا پھر اقبال، خضر ورومی سے گفتگو کر رہے ہوں یا 'سیرِ فلک' میں انھوں نے دوزخ کے اسرار ورموز آسمانوں کے مَلَک سے معلوم کیے ہوں۔

نہایت ہی سادہ سی نظم ''چاند اور تارے'' میں تارے اپنے قائد چاند سے تھکن کے

مارے نڈھال ہو کر پوچھتے ہیں :

نظارے رہے وہی فلک پر — ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا — چلنا ، چلنا ، مدام چلنا
بیتاب ہے اس جہاں کی ہر شئے — کہتے ہیں جسے سکوں، نہیں ہے

اور سب سے آخر میں یہ کہ :

ہوگا کبھی ختم یہ سفر کیا؟
منزل کبھی آئے گی نظر کیا؟

یہ سُن کر چاند اپنے ساتھیوں کی دلجوئی بالکل اُسی انداز میں کرتا ہے جیسے کسی فوج کا سپہ سالار اپنی تھکی ہاری لیکن فاتح فوج کی ہمّت بڑھاتا ہے:

ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ — کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام ، بے محل ہے — پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں! — جو ٹھہرے ذرا، کچل گئے ہیں

انجام ہے اِس خرام کا حُسن
آغاز ہے عشق ، انتہا حُسن

اقبالؔ کی شہرہ آفاق نظم ''تصویرِ درد'' واقعی درد و غم کا مرقع ہے؛ مراسلہ ملاحظہ فرمائیں:

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

اور پھر یہ جھنجھلاہٹ دیکھیے :

الٰہی پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا
حیاتِ جاوداں میری نہ مرگِ ناگہاں میری

اقبالؔ جانتے ہیں کہ ان کے معروضات یک طرفہ ہیں۔ آسمانوں کا نمگیرہ باطنی طور پر ان کی گذارشات کو خدا کے حضور پہنچا تو دے لیکن ظاہری طور پر اور دنیا کے محسوسات میں خدائے لم یزل کا بہ نفسِ نفیس تشریف لاکر جواب دینا معمولات میں نہیں۔ دنیا کے دیگر شاعروں کی طرح انھوں نے بھی ایک آرزو کی اور محدود رہبانیت نصیب ہو جانے کے لیے خدا کے حضور پیش کش کی ''ایک آرزو''۔ یہ نظم ممکن ہے ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیان لکھی گئی ہو لیکن اس میں جو فدائیت، دنیا سے بے رغبتی، کنارہ کشی اور آغوشِ فطرت میں زندگی کے بقیہ دن گزار کر انسانیت کی خدمت کرنے کی جو تیاری ملتی ہے بالکل وہی کیفیت اور غالبؔ کی طرح ''نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں'' والی کیفیت اقبالؔ نے اپنی زندگی کی آخری شام میں محسوس کی۔ ملاحظہ کیجیے کہ کس درد بھرے انداز میں وہ اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں...... سوالات کی افتاد دیکھیے۔ یہ خدا سے پوچھا جا رہا ہے:

سرودِ رفتہ باز آید کہ نا آید؟
نسیمے از حجاز آید کہ نا آید؟

سر آمد روز گارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ نا آید

اور ان کا یہ جو رونا دھونا تھا اور شکوہ و شکایت کے جو دفاتر کھولے گئے تھے ان کا مقصد صرف اور صرف یہ تھا کہ ان کا نالۂ نیم شبی، ان کی آہوں کی تڑپ، ان کا سوزِ دروں، نوجوان نسل میں منتقل ہو جائے۔ اس کے لیے بھی ایک مختصر مراسلہ ارسال ہے:

جوانوں کو مری آہِ سحر دے ۔۔۔ پھر ان شاہیں بچوں کا بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے ۔۔۔ مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اقبالؔ جب اپنے صاحبزادے جاوید اقبالؔ سے کچھ کہنا چاہتے تھے تو اس بات کا

اہتمام کرتے تھے کہ وہ بات منظوم ہو۔ حالانکہ جب اقبالؔ کی آنکھیں بند ہوئیں اس وقت جاوید اقبالؔ بہت چھوٹے تھے اور وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کسی بیرونی ملک بھی نہیں گئے ہوئے تھے۔ لیکن دراصل یہ خطوط انھوں نے جاوید کی معرفت نئی نسل کے نام لکھے ہیں۔ اقبالؔ کے اپنے لندن کے قیام کے دوران جب جاوید کا انھیں اوّلین خط ملا تھا تو اس کا جواب انھوں نے منظوم دیا تھا :

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر!
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مری غزل سے مئے لالہ فام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اس نظم کا محض اس لیے حوالہ نہیں دیا گیا ہے کہ اس میں مغرب کی تردید اور مشرق اور بطورِ خاص ہند کی مٹی یعنی یہاں کے افکار و خیالات سے کام لینے کی دعوت دی گئی ہے، بلکہ اس سے مقصود یہ ثابت کرنا بھی ہے کہ ڈاکٹر اقبالؔ نے صرف منظوم مراسلے ہی نہیں لکھے ہیں بلکہ منظوم جوابات بھی سپردِ قلم کیے ہیں۔

اب تک تو یہ ہوتا آیا تھا کہ اقبالؔ خدا سے مختلف پہلوؤں سے استفسار، گذارش یا شکایات کرتے، لیکن کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ خدا، اقبالؔ سے خود اُن کے ایک عام انسان ہونے کے ناطے اپنے احسانات اور کرم فرمائیوں کا حوالہ دے کر احتساب کرنے بیٹھ گیا

ہے۔ یہ اقبالؔ کا ہی دل گردہ ہے کہ اس نے نہ صرف یہ کہ خدا کی جانب سے سوالات کھڑے کیے بلکہ ان کا کافی وشافی جواب بھی دیا اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ خدا کی تخلیق کاری کے حدود جہاں ختم ہو جاتے ہیں وہاں سے بنی نوعِ انسان کی تخلیق کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔ پیام مشرق سے لیا گیا فارسی کا یہ مشہور مکالمہ بغور سماعت فرمائیں :

خدا

جہان را زیک آب و گل آفریدم تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولادِ ناب آفریدم تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہالِ چمن را
قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

انسان

تو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

(محاورہ مابینِ خدا وانسان : پیامِ مشرق)

ترجمہ

خدا : میں نے دنیا کو محض پانی اور مٹی سے پیدا کیا، تو نے ایران، توران اور ترکستان بنا ڈالے (اور میری دھرتی کو سرحدوں میں بانٹ دیا) میں نے مٹی سے خالص فولاد پیدا کیا، تو نے اس سے تلوار، تیر اور تو

بیں بنا ڈالیں۔ تو نے باغ کے نازک اور بے ضرر درختوں کے لیے کلھاڑے بنائے (اور اسی لوہے سے) خوش آواز پرندوں کے لیے پنجرے بناڈالے۔

انسان : اے خدا تو نے رات پیدا کی، میں نے چراغ بنایا۔ (تو نے) مٹی پیدا کی، میں نے اس سے پیالے اور کٹورے بنائے۔ تو نے ویرانے، پہاڑ اور جنگل بنائے، میں نے ان میں پیڑ پودے، باغ اور گلزار اگائے۔ میں وہ ہوں کہ پتھر سے آئینہ بناتا ہوں اور زہر سے شربت تیار کرتا ہوں۔

□□□

اقبال کا ادبی و تہذیبی ورثہ

ڈاکٹر علامہ اقبال کو اپنے دور کی ذہین ترین، حساس ترین اور متضاد ترین شخصیت سمجھنا چاہیے۔ اقبال نے کئی تہذیبوں کا منہ دیکھا تھا۔ کئی استادوں سے استفادہ کیا اور فلسفے کے علاوہ کئی مضامین پر دست رس حاصل کی۔ اقبال کی تخلیق میں بیک وقت مشرقیت، مغربیت، قادیانیت، تشیّع، سنّی حنفیت یہاں تک کہ ہندو دیو مالائیت کے اجزاء بھی پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری پر اصلاح داغ سے لی، فارسی اور عربی شمس العلماء سید میر حسن سے پڑھی۔ فلسفے اور تاریخ کا درس پروفیسر آرنلڈ اور نکلسن سے لیا۔ عمرانیات، قانون، سماجیات، منطق اور سیاسیات کا درس بیک وقت ڈاکٹر میک ٹیگرٹ، پروفیسر براؤن، پروفیسر وہائٹ ہیڈ اور سارلی سے لیا۔ یہ بات دعوے سے کہی جاسکتی ہے کہ جب تک اقبال زندہ رہے اپنے دور کے سب سے زیادہ پڑھے لکھے شخص کے طور پر دنیا کی آنکھوں کا تارہ بنے رہے۔ کیونکہ وہ بیک وقت دنیا کی معروف و متعدّد تہذیبوں، زبانوں اور علوم و مذاہب کے غوّاص تھے۔ جرمنی کے جامعہ برلن نے انھیں ڈاکٹریٹ سے نوازا، سرکارِ انگلستان نے انھیں ''سر'' کے خطاب سے سرفراز کیا، ہندی عوام نے انھیں ''ترجمانِ حقیقت'' اور ''شاعرِ مشرق'' کے القاب سے نوازا، روحانی حلقوں نے انھیں ''عارفِ کامل'' کی مسند پر بٹھایا اور پیشہ ور مولویوں نے انھیں کفر کے فتوے سے سنگ سار کیا۔ یہ کچھ ایسا غلط کام بھی نہیں تھا اگر اُس وقت کفر کا فتویٰ نہیں لگتا تو آج لگتا اور آج ہمارے کاموں میں ایک اور کام کا اضافہ ہو جاتا۔ پیشے کے اعتبار سے انھوں نے بے روزگاری، فقیری، پروفیسری، بیرسٹری، کونسل کی ممبری اور

شاعری کو اختیار کیا۔

اقبالؔ کے فکر و فلسفے میں بیک وقت پہاڑی ندی کا بہاؤ اور میدانی دریا کا ٹھہراؤ ہے۔ وہ رام اور نانک سے شروع ہوتے ہیں اور گوئٹے، نیٹشے، برگساں اور مسولینی سے ہوتے ہوئے خضرؑ اور مولانائے روم سے گذر کر شیطان تک سے مصافحہ کر لیتے ہیں۔ وہ اپنی نظر کی اس مستی سے خود عاجز ہیں۔

میں نو نیاز ہوں مجھ سے حجاب ہی اولیٰ
کہ دل سے بڑھ کے ہے میری نگاہ بے قابو!

(بالِ جبریل)

اقبالؔ کے ہاں بڑا توسّع ہے۔ ان کی وسیع المشربی ضرب المثل ہے۔ اگر وہ اسلامی شاعر تھے تو ان کے ہاں یونانی بنیادوں پر تعمیر کردہ مغربی فلسفے کا گذر بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ چہ جائیکہ ہندی اور ایرانی دیو مالائیت اور رومانیت کا۔ اقبالؔ مغربی تہذیب کے نقاد تھے۔ فلسفۂ مغرب کو زہرِ ہلاہل اور امام غزالیؒ کی تلقین، اُم ابنِ تیمیہؒ اور مولانائے رومؒ کے فلسفۂ اثبات و الٰہیات کو عالمِ انسانیت کے حق میں بالترتیب قندِ مکرّر اور تریاق گردانتے تھے۔ لیکن جہاں کہیں انھوں نے علوئے انسانیت، جوشِ جنوں، عشق و سرمستی، خودی و انابت اور کیف و وارفتگی کا شائبہ تک پایا، جی کھول کر اس کی تعریف کی۔ پھر اس بات کی انھوں نے پرواہ نہیں کی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ یہ جذبہ آپ کو مشرق و مغرب میں فراخدلی کا بھرم بھرنے والے بڑھے مصنفین، مفکّرین اور مستشرقین کے ہاں بھی نہیں ملے گا، پھر وہ چاہے گبن (Gibbon) ہو یا H.G.Wells یا ہیرالڈ لیمب یا اِدھر مشرق کے بڑے بڑے فلسفی اور مذہبی رہنما۔

مختلف قوموں اور تہذیبوں میں اتحاد و یگانگت یا آج کے دور کی تازہ ترین اصطلاح (Integration) یعنی 'یکجہتی' پیدا کرنے والی قوت کی اساس صرف دو چیزوں

پر ہے۔ایک ہے اعتبار (Confidence) اور دوسرا ہے احترام (Respect)۔ جہاں ان میں سے کسی ایک بات کا بھی دامن ہاتھ سے چھوٹا کہ قتل و غارتگری کا بازار گرم ہوا۔ اعتماد — کیا چیز ہے؟ اعتماد ہے باہم زندگی کرنے (Co-existance) کا تہیہ کر لینے کا اور احترام ضامن ہے بقائے باہمی (Co-survival) کا۔ جس دن مجھے یہ احساس ہو جائے کہ آپ میرا اور میرے عقائد کا احترام نہیں کرتے یا مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ ''مجھ سے نظر بچا کے کچھ کھا رہے ہیں آپ'' تو سمجھ لیجیے کہ میرے اور آپ کے درمیان نفاق کا بیج پڑ گیا۔ اقبالؔ اپنے دشمن پر بھی اعتبار کرتے ہیں اور اپنے مخالف کے عقائد کا بھی احترام کرتے ہیں۔ پھر اگر ان کا ہم عقیدہ بھی ان کی مرادوں اور معیار پر پورا نہیں اترتا تو اس کو کھری کھری سنانے میں وہ دریغ نہیں کرتے۔ انسان اور قوموں سے کیا لینا دینا، وہ ابلیس کی زبانی جبرئیل سے بھی الجھ پڑتے ہیں ۔

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ھو، اللہ ھو، اللہ ھو

وہ اس معیار کی تلاش میں اور اعتبار کی فضا میں سانس لینے کے لیے فرشتوں اور آدم کے اتالیق بن بیٹھے ہیں ۔

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اِس نے
آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی

یا پھر ۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمّتِ مردانہ

[تو اگر میری دیوانگی کو ویرانہ سمجھتا ہے تو سن لے کہ میں نے اس میں جبرئیل کو

پکڑ رکھا ہے اور اب اگلا ارادہ خدا پر جال پھینکنے کا ہے]

مذاہب اور تہذیبوں کی باہمی آویزش صدیوں پرانی ہے۔ یہ ایک حسین اتفاق نہ ہے کہ اقبالؔ اس آویزش کا شکار نہیں ہوئے۔ انھوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اس میں بیک وقت تین قومیں باہم دِگر آویزاں تھیں۔ ان کی زندگی کی آخری سانسوں تک ہندو مسلم منافرت کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ تیسری تھی حکمراں اور فاتح قوم جو بھارت کی فصیلوں کے بیچ شترِ بے مہار کی طرح دندناتی پھر رہی تھی اور وہ تھی انگریز۔ سات سمندر پار سے آئی ہوئی۔ تند خو اور دُریدہ دہن، ظالم اور جفا خو اور کینہ پرور؛ اس سے لوہا لینا آسان نہ تھا۔ اقتدار، قانون، قوتِ نافذہ اور طاقت کا بے دریغ استعمال اس کی سرشت میں داخل تھا۔ اقبالؔ چاہتے تو اپنے ذکی و زیرک ذہن سے اور ادیانِ عالم کے تقابلی مطالعے کے زور پر جو اُن کی طبیعت کی خاص جولانگاہ تھی، ہندو تہذیب و طرزِ فکر پر بڑے تیکھے وار اور زوردار حملے کر سکتے تھے اور فلسفۂ الٰہیات میں اچھے اچھوں کے دانت کھٹے کر سکتے تھے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اربابِ حل و عقد اُن کے پورے کلام میں سے ایک شعر بھی ایسا نہیں نکال سکتے جس میں انھوں نے ہندو مسلم منافرت کو ہوا دی ہو۔

اقبالؔ کی شاعری کو عام طور پر تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کی نشاندہی سب سے پہلے ان کے ہم عصر اور قریبی دوست، انگلستان اور یورپ کے ساتھی شیخ عبدالقادر بیرسٹرایٹ لاء نے کی تھی۔ پہلا دور ہے ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک کا ہے۔ دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کا اور تیسرا دور ہے ۱۹۰۸ء سے آگے کا۔ یورپ سے لوٹ آنے کے بعد یعنی ۱۹۰۸ء سے آگے کا دور اقبالؔ کی شاعری کا پختہ ترین دَور شمار کیا جاتا ہے۔ اس دور میں اقبالؔ کے فہم و ادراک کو یکسوئی حاصل ہو چکی تھی اور وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنی فکر کو شعر کے قالب میں ڈھال رہے تھے۔ ہم نہایت احتیاط کے ساتھ اقبالؔ کے تیسرے دور کی

شاعری سے ان کی مشہور نظم ''رام'' یہاں پیش کر رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ۔

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند

یہ ہندیوں کے فکرِ فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بامِ ہند

اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نامِ ہند

ہے رام کے وجود پر ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تراز سحر ہے زمانے میں شامِ ہند

تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوشِ محبت میں فرد تھا

(رام : بانگِ درا)

یہاں صرف رام سے عقیدت کا اظہار ہی نہیں ہے بلکہ بیک وقت حبِ وطن، وطن کے تہذیب وفلسفے پر اعتبار وافتخار، عالمِ انسانیت میں اس ملک کے علوئے آدمیّت کا پرچار اور ذہنِ ہندی کی مدح سرائی اس نظم کی خصوصیات میں شامل ہے۔

صرف اسی ایک نظم پر محمول نہیں بلکہ اقبال نے جابجا ہند کا جغرافیہ، تہذیبی روایات، شخصیات، اقدار، مذاہب، فلسفے اور تاریخ کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ اس کے برعکس آپ تصور کریں کہ جب یہاں انگریزی استعمار مستحکم ہو چکا تھا اور یہاں قانون West Minster Abey سے ڈھل کر آتے تھے اور 10, Downing Street لندن میں پرندے کو پَر مارنے کی بھی اجازت نہ تھی، اس نازک وقت میں اقبال نے مغرب کی مذمت کی ہے۔ اسلام اور عیسائیت میں قربِ فکری اور دونوں مذاہب کے آسمانی، الہامی اور حاملِ کتاب ہونے کے باوجود اقبال نے اس بات کی مطلق پرواہ نہ کی۔ اسلام اور ہندو مذہب میں بھارت کی حد تک تہذیبی اور سماجی یکسانیت ضروری ہے، لیکن ان مذاہب

کے فکر و عقائد میں بعد المشرقین ہے۔ اقبالؔ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ حکمراں قوم کی عیسائیت وہ عیسائیت نہیں ہے جو حضرتِ عیسٰیؑ لائے تھے بلکہ یہ وہ عیسائیت تھی جسے سینٹ پال کی عیسائیت کہنا بجا ہوگا جو اپنے وجود کے مرکز سے دور ہو چکی تھی۔ اقبالؔ نے اس پر کھل کر حملے کیے اور اس تہذیب نے اپنی شاطرانہ اور شیشہ گرانہ چالوں سے جو نئے کھلونے عصرِ حاضر کے سامنے ڈال رکھے تھے ان کی خوب مزاحمت کی۔ اسے نئی تہذیب کے ''گندے انڈے'' سے تعبیر کیا ہے۔ ان کی نظر میں جمہوریت نئے دور کا تازہ فتنہ ہے۔ فرماتے ہیں :

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِّ مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری
گرمئ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری!

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

(خضرِ راہ : بانگِ درا)

یا پھر طلوعِ اسلام کے یہ اشعار دیکھیے :

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت، ناز تھا جس پر، خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے
پھر اٹھی ایشیاء کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جو لانگہِ اطلس، قبایانِ تتاری ہے

(طلوعِ اسلام : بانگِ درا)

لندن سے متعلق اقبالؔ کے ذاتی تاثرات کیا ہیں؟

تو بھی ہے شیوۂ اربابِ و وفا میں کامل
دل میں لندن کی ہوس لب پہ ترے ذکرِ حجاز

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

میری نظر میں اقبالؔ کا سب سے بڑا تہذیبی ورثہ ، مشرق و مغرب کے درمیان حدِ فاصل کھینچ کر بھارتی عوام کو حکمراں قوم کی مرعوبیت سے آزاد کروانا ہے۔ مغرب، بھارت میں اپنی تہذیب کو پورے طور پر مسلّط کروانے میں ناکام رہا۔ آج جو آپ مغرب کی یلغار دیکھ رہے ہیں یہ دراصل اس کی حرکتِ مذبوحی ہے۔ جس میں اس مرتبہ اس نے جنسیات اور اباحیت پسندی کا سہارا لیا ہے۔ لیکن مشرق کی نیو میں اور بطورِ خاص اس کے نوجوانوں کے ذہن میں مغرب سے مرعوبیت کا خیال، خام پڑ چکا ہے۔ جب اس چمک کا طلسم ٹوٹے گا تو مشرق اپنے اقدار کی بنیادوں کی طرف لوٹ آئے گا اور اقبالؔ کی پیشین گوئی کے مطابق مغرب کی تہذیب خود اپنے خنجر سے خودکشی کرلے گی۔ آج کے یورپ میں اس کے آثار پیدا ہو چکے ہیں۔ ویسٹ منسٹر ایسے تنکے پر کھڑا ہے۔ گیٹ (GATT) اور ڈنکل تجاویز اس کے نئے پینترے ہیں۔ کارل مارکس اقبالؔ کی نظر میں پیغمبر تو نہیں مفکر ضرور تھا لیکن اس کی کتاب کے اوراق بھی روس، پولینڈ، زیکوسلواکیہ، بلغاریہ، مشرقی جرمنی اور یمن میں پھٹ چکے ہیں۔ مجذوبِ فرنگی تو کب کا مر چکا لیکن اب مغرب مقامِ کبریا کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ نئے بت تراشنے کے کارخانوں پر اب اوس پڑنے والی ہے۔

اقبالؔ کا دوسرا سب سے اہم تہذیبی ورثہ مشرق کی بازیافت ہے۔ وہ مشرق کو مغرب کا اتالیق بنانا چاہتے ہیں لیکن اس کی شرط ہے، محبت! سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا

کرنے کی صلاحیت۔ آپسی منافرت اور جنگ وجدل کی غلامی سے نجات!

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو بُرا نہ مانے — تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بَیر رکھنا تو نے بُتوں سے سیکھا — جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر وحرم کو چھوڑا — واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں کو سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

سونی پڑی ہوئی ہے مدّت سے دل کی بستی — آ! اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ — دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

(نیا شوالہ : بانگِ درا)

یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ پچھلی صدی میں جتنے بھی بڑے لوگ ہم سے رخصت ہوئے وہ سب ہم سے ناراض اور بیزار گئے۔ موت کے وقت وہ ایک عجیب کرب میں مبتلا تھے۔ گاندھی جی ہم سے ناراض گئے۔ سرسیّد احمد خان، مولانا محمد علی جوہرؔ، مولانا ابوالکلام آزادؔ، شبلیؔ، حالیؔ، ڈاکٹر ذاکر حسین، حسرتؔ موہانی، پنڈت نہرو، یہاں تک کہ جوشؔ، ظفر علی خان، کس کس کے نام گنوائیں۔ ہر شخص اپنی اپنی صلیب پر ناقدری کی منہ بولتی تصویر دکھائی دیتا ہے۔ یہ لوگ ٹھوکریں مار مار کر ہمیں جگاتے رہے لیکن ہم تھے کہ اپنے حال میں مست اور اپنے اپنے خول میں مگن پڑے رہے۔ اقبالؔ اس عمومی پژمردگی سے کیسے مستثنیٰ رہ سکتے تھے۔ ان کے آخری اشعار کس سوز میں ڈوبے ہوئے ہیں ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟
نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟

سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید؟

[خدا جانے ہماری عظمتوں کا وہ پچھلا دَور لَوٹے گا بھی کہ نہیں۔ ملّہ کی سرزمین سے کسی خوش خبری کی اُمید کروں یا نہ کروں؟ میں تو اب موت سے ہمکنار ہوں۔ پتہ نہیں، عالم کے راز جاننے والا اب کوئی دوسرا آئے گا بھی یا نہیں!]

اقبالؔ کا یہ سوزِ دروں، اقبالی تہذیب کا یہ آخری ورثہ انھوں نے نوجوانوں کے سُپرد کیا ہے۔ ہم اس کے امین ہیں۔ کیا اس امانت کو ہم اپنے سینوں اور سفینوں میں ہی دفن رکھیں گے اور اقبالؔ کی یہ وصیّت اور مناجات رائیگاں جائے گی :

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اقبالؔ دوسرے فلسفیوں کی طرح اپاہج اور بیساکھیوں کے سہارے چلنے والوں میں سے نہیں تھے۔ ان کے ہاں شش جہات پر نظر رکھنے والی نگاہ اور ہر درد کا درماں بھی تھا۔ وہ اگر کوئی فرمائش کرتے ہیں تو اس کے حصول کا راستہ بھی بتا دیتے ہیں۔ یہی نہیں اِس راستے میں دَر آنے والے میل کے ہر ہر پتھر، نشیب و فراز اور مشکلات و میسّرات سے واقف کروا دیتے ہیں۔ اقبالؔ اپنے ناموس کی حیاتِ جاودانی کے لیے بہت متفکر تھے۔ قوم کی خوابناکی اور بے حسی، مغرب کے بڑھتے ہوئے استعمار اور بھارت میں بسنے والی مختلف ملتوں کی پراگندگی اقبالؔ کو پریشان کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ اپنے ناموس کے لیے بہت حسّاس بھی تھے۔ وہ اپنے ناموس کو ''ناموسِ ازل'' گردانتے تھے۔ اس گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے مشتے از

خرو ارے کے طور پر اقبال کے درد سے بھرے چند اشعار پیش کرتا ہوں جو اس مقام، زمانہ اور ہمارے دعوے کی دلیل کے لیے نہایت ضروری ہیں :

ناموسِ ازل را تو امینی تو امینی — دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی — صہبائے یقیں درکش واز دیر گماں خیز

ازخواب گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

فریاد زافرنگ و دلآویزیٔ افرنگ — فریاد ز شیرینیٔ و پرویزیٔ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ — معمارِ حرم! باز بہ تعمیر جہاں خیز

ازخوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

(نظم ۱۹ : زبورِ عجم)

ترجمہ : خدا کے اوّلین پیغام کا تو امین ہے اور اس کی تو لاج رکھ لے۔ دنیا کی حکمرانی کو تو سنوار اور سنبھال۔ تو نہیں واقف کہ تو خاک سے پیدا ہے لیکن تو لافانی اور یقینی ہے۔ یقین کی شراب لنڈھا اور جھومتا اٹھ۔

جاگ! میٹھی نیند سے جاگ ؛ میٹھی گہری نیند سے جاگ!

یہ کیا بات ہوئی کہ تو مغرب کی شکایت بھی کر رہا ہے، لیکن تیرا دل ہے کہ مغرب میں اٹکا ہوا ہے۔ گویا ایک طرف تو شیریں کی محبت کا دم بھرتا ہے اور دوسری طرف پرویز (خسرو) کی حکمرانی کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ کیا تو واقف نہیں کہ مغرب کی چنگیزی نے سارے عالم کو ویران اور برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ تو نے تو حرم کی تعمیر کی ہے۔ اٹھ اب دنیا کی تعمیر کا تہیہ کر لے۔

جاگ! میٹھی نیند سے جاگ ؛ میٹھی گہری نیند سے جاگ!

□□□

علامہ اقبالؔ کی فارسی شاعری

ڈاکٹر علامہ اقبالؔ کی تصنیفات کی اشاعتوں کا اگر ہم زمانی جائزہ لیں تو بعض نہایت دلچسپ حقائق سامنے آتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ انھیں ساری دنیا ایک شاعر اور ایک فلسفی کی حیثیت سے جانتی ہے۔ لیکن ان کی سب سے پہلی تصنیف جو منظرِ عام پر آئی وہ نہ تو فلسفے پر تھی اور نہ ہی شاعری تھی بلکہ علم الاقتصاد (Economics) پر تھی۔ اس کے بعد پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے لکھا گیا انگریزی مقالہ ''فلسفۂ ایران'' اور پھر ''تشکیلِ الٰہیاتِ جدید'' کے بعد جو سب سے پہلی کتاب طبع ہوئی وہ فارسی کی تھی اور اس کا نام ''اَسرارِ خودی'' ہے۔

یہ کتاب ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی حالانکہ اس کتاب کی اشاعت سے بہت پہلے، جب اقبالؔ ۱۹۰۵ء میں پہلی مرتبہ انگلستان گئے تو وہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا''، ''ہمالہ''، ''گائے اور بکری''، ''نیا شوالہ'' اور اسی قبیل کی دوسری تقریباً ۵۰ نظمیں لکھ چکے تھے۔ اور ان نظموں نے غیر منقسم ہندوستانی عوام میں ایک ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ لیکن اس زمانے میں ان کی شاعری اس قدر نہیں تھی کہ اسے مرتب کر کے کوئی مستقل مجموعہ شائع کیا جاتا۔

قبل اس کے کہ ہم ان کی فارسی شاعری کا جائزہ لیں، ضروری سمجھتے ہیں کہ اقبالؔ کی اردو اور فارسی تصانیف کی مشترکہ فہرست سن اشاعت کے اعتبار سے پیش کر دیں :

۱۔ اسرارِ خودی	(فارسی)	۱۹۱۵ء
۲۔ رموزِ بے خودی	(فارسی)	۱۹۱۸ء

۳۔ پیامِ مشرق	(فارسی)	۱۹۲۲ء
۴۔ بانگِ درا	(اردو)	۱۹۲۴ء
۵۔ زبورِ عجم	(فارسی)	۱۹۲۵ء
٦۔ جاوید نامہ	(فارسی)	۱۹۳۲ء
۷۔ بالِ جبریل	(اردو)	۱۹۳۵ء
۸۔ ضربِ کلیم	(اردو)	جولائی ۱۹۳٦ء
۹۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق	(فارسی)	۱۹۳٦ء
۱۰۔ رمغانِ حجاز	(اردو)	۱۹۳۸ء
۱۱۔ ارمغانِ حجاز	(فارسی)	۱۹۳۸ء

اس اشاعتی ترتیب کا تجزیہ کچھ اس طرح ہوگا :

اوّلین تین کتابیں فارسی میں شائع ہوئیں۔ ڈاکٹر اقبالؔ نے نظم کی کل ۱۱؍ کتابیں لکھیں۔ ان میں ۷؍ فارسی کی ہیں۔ اردو کی صرف ۲؍ کتابیں ایسی ہیں جو یکے بعد دیگرے شائع ہوئیں یعنی ''بالِ جبریلؔ'' اور ''ضربِ کلیمؔ''۔ فارسی کے مقابلے میں اردو کا کلام صرف ٦۷؍ فیصد ہے۔ یعنیفارسی کے دوتہائی۔ اقبالؔ کے کلام میں سب سے طاقتور فکر ''فلسفۂ خودی'' ہے جو بتدریج ان کی شاعری کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اُردو میں ایک بھی کتاب انھوں نے خالصتاً اس فکر کی اشاعت کے لیے مختص نہیں کی جس کے عنوان سے علامہ پر طاری خودی کے غلبے کا اشارہ ملتا ہو .... جبکہ ''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بے خودی'' دو مستقل کتابیں اسی عنوان کے تحت چھپیں۔ فارسی کلام میں انھوں نے اپنی فکر کو پیش کرنے کے لیے تقریباً ۲۷۸؍ شخصیات کا تذکرہ متعدّد مقامات پر کیا ہے، جبکہ اردو شاعری میں صرف ۱۸۸؍ شخصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے، اقبالؔ اپنے دور کے سب سے زیادہ پڑھے

لکھے انسان تھے۔ مشرق و مغرب کے کتب خانے، تحریریں اور تحریکیں انھیں ازبر تھیں۔ انھوں نے جی کھول کر پڑھا اور جی کھول کر مشرق و مغرب کے دانشوروں کو اردو اور فارسی کے اقلیمِ ادب اور قلمروِ سخن میں جوازِ سفر (Passport) اور تاشیرے (Visas) عطا کیے۔ یہ ساری شخصیات محفلِ اردو میں اقبالؔ سے پہلے نہ کبھی دیکھی گئیں اور نہ اب تک دوبارہ ان کا ورود ہوا ہے۔

ذرا یہ فہرست سنیے جو صرف نمونۃً ہے : ہیگل، میک ٹیگرٹ، لانگ فیلو، ولیم کوپر، سپنوزا، سٹنڈل، سوامی رام تیرتھ، بھرتری ہری، معّری، شکری، ایمرسن، مسعود سعد سلمان، ابنِ بدرون وغیرہ کلامِ اردو میں جلوہ افروز ہیں۔

فارسی کلام میں اجنبی مہمانوں کی آمد اس سے زیادہ ہے : آئن سٹائن، لطف اللہ آذر، اقلیدس، بابر، کومٹ اگسٹس، امراء القیس، علی ہجویری، بُصیری، رابرٹ براوَننگ، بوڈن اسٹاٹ، پلائن، ہورن پال، دیلمی، ڈومر، برونو، فرانسس بیکن، پٹوفی، گوتم بدھ، جاپان، لیوتا لستائی، زُہَیر بن کعب، سام، چارلس، ریمی، روکرٹ، شلر، شوپن ہار، بیل سوشکی، سٹانگ لِٹز، لِنٹ ہولڈ، فان یاک، عزّت بخاری، مہدی سوڈانی، لاک، سلطان محمد فاتح، لوشکے، فان ہیمر، ہرڈر، ہائینا، ہرمن اسٹال وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔فارسی کلام میں ڈاکٹر اقبال نے اپنی پیغام رسانی فلسفۂ خودی کی تکمیل اور مغرب کی روحانی ضیافت کی منصوبہ بند اور شعوری کوشش کی ہے۔

''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بیخودی'' دراصل ایک سکّے کے ۲/ دو رُخ ہیں یا ایک کتاب کے دو ابواب ہیں۔ ڈاکٹر نکلسن نے اسرارِ خودی کا سب سے پہلے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اس ترجمے پر یورپ اور امریکہ میں لاتعداد ریویو شائع ہوئے، جس سے دنیائے مغرب میں اقبالؔ کی شخصیت مستند اور شہرت مستحکم ہوگئی۔

ڈاکٹر اقبالؔ نے اسکول یا کالج میں کبھی سبقاً فارسی نہیں پڑھی۔ وہ خود کہتے ہیں کہ :

"انھیں (لوگوں کو) یہ نہیں معلوم کہ میں نے فارسی زبان کی تحصیل کے لیے اسکول ہی کے زمانے میں کس قدر محنت اٹھائی اور کتنے اساتذہ سے استفادہ کیا۔"

اس کے علاوہ مولوی سید میر حسن اور قیامِ یورپ کے زمانے میں ڈاکٹر نکلسن اور براؤن کے فیضِ صحبت نے ان کے فارسی ذوق کو اور چمکایا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبالؔ نے زبانِ فارسی کو اظہارِ فکر کے لیے کیوں اختیار کیا اس سلسلے میں عرض ہے کہ :

۱) وہ اپنا پیغام ہندوستان سے باہر دوسرے ممالک میں پہنچانا چاہتے تھے تاکہ مسلمانوں کی اکثریت اس کو پڑھ سکے۔

۲) عربی زبان نہایت وسیع ہے، لیکن عربی شاعری کا دامن فلسفہ وتصوّف سے بالکل خالی ہے، اس لیے وہ اپنی عربی دانی کے باوجود عربی زبان کو اختیار نہ کرسکے۔

۳) اُردو کا جغرافی اور لسانی دائرہ محدود ہے۔ اس کے برعکس فارسی برِصغیر میں Lingua Indica کے جلیل القدر عہدے پر فائز رہ چکی تھی۔ پھر یہ کہ پورا ایران، افغانستان اور روس میں شامل اسلامی ممالک، ترکمانستان، ترکیہ یہاں تک کہ آج بھی عراق، امارات اور جزیرہ نمائے عرب کا ایران کی سرحد سے ملحقہ علاقہ مادری زبان اور ثانوی زبان کے طور پر فارسی کا استعمال کرتا ہے۔

۴) اقبالؔ کے متصوّفانہ اور فلسفیانہ خیالات کے اظہار کے لیے فقرے، اصطلاحیں اور تلمیحات فارسی میں موجود تھیں اور اقبال نے اپنی فکر کی ترسیل کے لیے الفاظ ومعانی کا یہ ربط زیادہ سہولت بخش محسوس کیا ہوگا۔

۵) ہندوستانی اور ایرانی نژاد فارسی شعراء اقبالؔ کے مطالعے میں رہے۔ پھر یہ کہ اقبالؔ

مریدِ ہندی ہیں اوران کا پیر جلال الدین رومی فارسی کا شہرہ آفاق شاعر ہے۔اور جہاں تک عشق وخودی کے تصوّر کا تعلق ہے وہ اقبال نے مولانا روم سے ہی اخذ کیا تھا۔ان کے لیے فارسی میں شعر کہنا ایک روحانی سعادت ہی نہیں بلکہ ضرورت بھی تھی۔

اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی کے بعد اقبال کی سب سے اہم کتاب ''پیامِ مشرق'' ہے۔یہ دراصل مشہور جرمنی شاعر گوئٹے (Goethe) کے ''مغربی دیوان'' کا جواب ہے۔ اقبالؔ نے اپنا اور گوئٹے کا موازنہ ایک شعر میں اس طرح کیا ہے ؎

او چمن زادے ، چمن پروردۂ
من دمیدم از زمینِ مردۂ

[وہ چمن میں پیدا ہوا اور باغوں میں پلا بڑھا، لیکن میں تو ایک مردہ زمین سے روشنی بن کر پھوٹا]

''پیامِ مشرق'' کے چار حصے ہیں :

۱) شروع کے تقریباً ۸۰ صفحات میں قطعہ نما رباعیات ہیں۔اس حصے کا نام ''لالۂ طور'' ہے۔

۲) دوسرے حصے کا عنوان ''افکار'' ہے۔ پیامِ مشرق کا یہ سب سے طاقتور حصہ ہے۔ فصلِ بہار، خدی، محاورہ مابینِ خدا وانسان، ساقی نامہ، الملک للہ اور کشمیر جیسی لاجواب نظمیں اسی حصے میں ہیں جن میں یمِ زندگی دمادم رواں ہے۔

۳) تیسرا حصہ ''مئی باقی'' کے عنوان سے ہے اس میں تمام تر غزلیں ہیں، جو خواجہ حافظ کی غزلوں کی طرح جوش ومستی سے لبریز ہیں۔

۴) چوتھے اور آخری حصے کا عنوان ''نقشِ فرنگ'' ہے۔اس میں مغرب کے مشاہیر، ادباء اور فلسفیوں کے افکار وخیالات اور شخصیات پر نہایت خوبصورت شعری تبصرے ہیں۔

''پیامِ مشرق'' کی اشاعت کے ایک سال کے اندر اندر ''زبورِ عجم'' شائع ہوئی۔ ''پیامِ مشرق'' کی طرح اس کے بھی چار حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ۵۶/غزل نما پر جوش ترانے ہیں۔ان میں سخنِ دلنواز کے ذریعے اقبال نے کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

دوسرے حصے میں ۷۵/غزلیں ہیں۔ اُن میں جوش و مستی اپنے شباب پر ہے۔ تیسرے حصے کا عنوان ''گلشنِ رازِ جدید'' ہے جو شیخ سعد الدین شبستری کی ''گلشنِ راز'' کا نئے انداز میں جواب ہے۔ اس میں ۹/منظوم سوالات کے فلسفیانہ جواب ہیں۔ چوتھا حصہ ''بندگی نامہ'' کے عنوان سے ہے۔ نہایت مختصر ہے۔ اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ فنونِ لطیفہ مثلاً موسیقی، مصوری اور فنِ تعمیر اگر غلاموں کے سپرد کر دیے جائیں تو ان سے زندگی کی رمق رخصت ہو جاتی ہے۔

مشہور اطالوی شاعر ''دانتے'' *(Alighieri Dante 1265 - 1321)* کی شہرہ آفاق تصنیف ''دیوینا کاموڈیا'' *(Divine Comedy)* [لطیفہ غیبی] میں عربی زبان، معراجِ نبویؐ، عذاب و ثواب اور جنت و دوزخ سے متعلق احادیثِ نبوی کا زبردست اثر اور امتزاج پایا جاتا ہے۔ یہ دراصل ایک آسمانی ڈرامے کا پلاٹ ہے اور پیش کش کا اسلوب بھی ڈرامائی ہے۔

ڈاکٹر اقبال نے اِسی اطالوی شاعر دانتے کی ڈیوائن کامیڈی (دیوینا کاموڈیا) کے تتبع میں ''جاوید نامہ'' کی تصنیف کی ہے اور افلاک کی سیر کے دوران مختلف تاریخی شخصیتوں اور روحوں سے دورِ حاضر کے مسائل پر گفتگو کی ہے۔ اس کی ڈرامائیت تھیٹر اور سنیما کی طرح پڑھنے والوں کی دلچسپی کو برقرار رکھتی ہے۔ ''جاوید نامہ'' کی تصنیف کے وقت علامہ کے سامنے صرف Divine Comedy ہی نہیں بلکہ شیخ محی الدین ابنِ عربی کی

فتوحاتِ مکیہ اور ابوالعلا معری کی ''رسالہ الغفران'' بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی یہ کتاب نہایت اہم خیال کی جاتی ہے۔

اردو میں ''بالِ جبریل'' اور ''ضربِ کلیم'' کی اشاعت کے بعد ان کی دوسری فارسی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' کے عنوان سے ان کے وصال سے دو سال قبل شائع ہوئی۔

یاد رہے کہ اب علامہ اقبال کی علالت کا سلسلہ جاری ہو چکا ہے اور آپ علاج کی غرض سے بھوپال میں مقیم ہیں کہ ۳/اپریل ۱۹۳۶ء کی شب وہ خواب میں دیکھتے ہیں کہ سرسیّد احمد خان تشریف لائے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ تم اپنی علالت کا ذکر حضورِ رسالت مآبؐ میں پیش کرو۔ آنکھ کھلی تو یہ شعر زبان پر تھا ؎

با پرستارانِ شب دارم ستیز
باز روغن در چراغِ من بریز

[اندھیروں کے پجاریوں سے لوہا لے رہا ہوں۔ قبل اس کے کہ میرا چراغ بجھ جائے اس میں دوبارہ تیل فراہم کیجیے]

اس کتاب کے مطالعے سے مشرقی ممالک کے لیے علامہ اقبال کی بیتابی اور تڑپ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ اقبال ایک ایک فرد کا گریبان پکڑ پکڑ کر اسے جھنجھوڑ رہے ہیں اور مغرب کی شاطری، عیاری اور جمہوری نظام کی فسوں کاری سے آگاہ کر رہے ہیں۔ اس کتاب کے اخیر میں مثنوی ''مسافر'' بھی درج ہے جو اقبال نے اپنے سفرِ افغانستان کے دوران کہی تھی۔

علامہ اقبال کی سب سے آخری کتاب ''ارمغانِ حجاز'' ہے۔ جو نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ ابتداءً اس کتاب میں اُردو اور فارسی دونوں کلام شامل تھا لیکن بعد میں الگ

الگ کر دیا گیا۔ شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ارضِ حجاز اور حضورِ رسالتمآبؐ سے ڈاکٹر اقبالؔ کو کس قدر مناسبت و محبّت تھی۔ متعدد مواقع میسّر آنے کے باوجود اقبالؔ ارضِ پاک کی زیارت سے محروم رہے۔ تاہم اس کتاب کے ذریعے انھوں نے اپنا معنوی اور روحانی نذرانہ پیش کیا ہے۔ فارسی ''ارمغانِ حجاز'' کے ۵ رحصّے ہیں۔ (۱) حضورِ حق (۲) حضورِ رسالتؐ (۳) حضورِ ملّت (۴) حضورِ عالمِ انسانی (۵) بہ یارانِ طریق۔۔۔۔۔

ارمغانِ حجاز میں کل ۳۷۳ ر رباعیات ہیں۔ دیباچے کے طور پر ہر حصّے کی ابتداء کسی رباعی یا شعر سے کی گئی ہے۔ ''حضورِ رسالتؐ'' والے باب کے دیباچے کے لیے عزّت بخاری کے اس شعر کا انتخاب کیا ہے :

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا

اسی طرح تیسرے حصّے یعنی ''حضورِ عالمِ انسانی'' کے دیباچے کے طور پر ڈاکٹر اقبالؔ نے جو شعر تحریر کیا ہے اس سے اُن کی انسانیت نوازی ٹپکتی ہے

آدمیّت　احترامِ　آدمی
باخبر　شو　از　مقامِ　آدمی

(جاوید نامہ)

جیسا کہ ہم اس مضمون کے پہلے حصے میں عرض کر چکے ہیں کہ صرف فارسی ہی نہیں بلکہ اردو شاعری میں بھی اقبالؔ نے نظریۂ خودی کو پوری طاقت اور توانائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اپنے تصوّر کو فروغ دینے کے لیے انھوں نے ''تکلّف برطرف'' والا وطیرہ اختیار کیا ہے۔ خودی —— بیخودی اور عشق سے متحرّک اور فروزاں ہوتی ہے۔ اگر وہ مسولینی اور مارکس میں بھی خودی کی رمق پاتے ہیں تو بلاشبہ اس کو اپنے کلام میں جگہ دیتے ہیں۔ وہ

عشق اور زندگی کی تلاش عصائے موسیٰؑ سے لے کر آتشِ نمرود کے شعلوں کی خاموشی میں بھی کرتے ہیں۔ جوئے کہستاں، لالۂ صحرائی، دشت کی پہنائی، چاندی، سونا، پارہ، بیاباں ، ببول ، کانٹے اور پھول، اقبالؔ کے لیے سب کے سب زندگی کی علامت ہیں۔ اقبالؔ کا جبریلؑ کو شیطان سے یہ کہلوانا کہ :

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو

یا پھر یہ کہ:

در دشتِ جنونِ من جبریلؑ زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمّتِ مردانہ

اور پھر آگے :

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اُس نے
آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی

کہہ چکنے کے بعد ذرا یہ اعتراف دیکھیے :

شعلۂ درگیرزد برخس و خاشاکِ من
مرشدِ رومی کہ گفت ''منزلِ ما کبریا ست''

[میرے جسم و جاں کی گھاس پھوس نے اب آگ پکڑلی ہے۔ میرے پیر و مرشد مولانا روم نے مجھ سے کہا ہے کہ چل اٹھ! اب ہماری منزل خدائے تعالیٰ ہے]

دراصل یہ سب مولانا رومؔ کے اس شعر کی تفسیریں ہیں ۔

ما ز فلک برتریم، وز ملک افزون تریم
زین دو چرا بگزریم منزلِ ما کبریا ست

(مولانا روم)

[ہم آسمانوں سے بلند اور فرشتوں سے برتر ہیں۔ ان دونوں کو طے کر کے ہمیں تو خالقِ کائنات کی منزل گانٹھنی ہے]

پڑھ لینے کے بعد شاید یہ بتانے کی ضرورت باقی نہ رہے کہ خودی کی فکر، اقبالؔ کو مریدِ ہندی ہونے کے ناطے مولانا رومؒ سے روحانی ورثے میں ملی تھی۔

اقبالؔ کی غزلوں کا نہایت طاقتور سرمایہ ''بالِ جبریلؑ'' میں موجود ہے۔ لیکن ان کی فارسی غزلیں اس فن کا بے مثل نمونہ ہیں۔ اقبالؔ کی فارسی غزلیں جہاں حافظ کی سرمستیاں رکھتی ہیں وہیں وہ ان کے فلسفۂ خودی و عشق کا سرچشمہ بھی ہیں۔ اِس بیان کے ثبوت کے طور پر، اقبالؔ کی فارسی غزلیات میں سے صرف ایک شعر اور ایک قدیم شاعر کی غزل کا ایک شعر تقابل کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے جسے پڑھ کر آپ بخوبی اندازہ لگا سکیں گے کہ اقبالؔ نے اپنی غزلوں میں خارہ شگافی کے بجائے شیشہ گری ہی نہیں بلکہ آئینہ سازی کی ہے۔ اقبالؔ کا شعر یہ ہے ؎

''بامید آن کہ روزی بشکار خواہی آمد''

زکمندِ شہر یاران رمِ آہوانہ دارم

(اقبالؔ)

دراصل اقبالؔ نے اپنے شعر کو امیر خسروؔ کے اس شعر کے پہلے مصرعے کو لے کر ترقی دی ہے ؎

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف

بامید آن کہ روزی بشکار خواہی آمد

(امیر خسروؔ)

خسرو کا کہنا یہ ہے کہ ''ہم جنگل کی ہرنیں اپنے سروں کو ہتھیلی پر لیے کب سے آپ کی منتظر ہیں کہ کبھی تو حضور اس طرف شکار کے لیے تشریف لائیں گے!'' اس کے مقابلے میں اقبالؔ یہ کہتے ہیں کہ ''میرے شکار کے لیے تو والیانِ شہر نے جال بچھا رکھے تھے۔ لیکن میں تو (چونکہ) آپ ہی کے ہاتھوں شکار ہونا چاہتا تھا اس لیے اُن کمندوں پر سے ایک ہی

LIBRARY BHOPAL
ESTD 1939
Tel.. 2542659

چھلانگ میں بچ نکلا۔‘‘

علامہ اقبالؔ کی ایجابی فکر کو سمجھنے کے لیے اُن کے فارسی کلام کا مطالعہ ضروری ہے۔ اگر کوئی صاحب، اقبالؔ کے فارسی کلام کو پڑھے بغیر یہ دعویٰ کر بیٹھیں کہ، ’’میں ماہرِ اقبالؔ ہوں‘‘ تو گویا انھوں نے سب سے بڑا جھوٹ بولا۔ آج جب کہ فارسی زبان کا بھارت سے چل چلاؤ ہے، اس بات کا خدشہ بہت بڑھ گیا ہے کہ کہیں ’’فکرِ اقبالؔ‘‘ کو سمجھنے والے ہی دنیا سے ناپید نہ ہو جائیں۔ ’’فکرِ اقبالؔ‘‘ اور ’’کلامِ اقبالؔ‘‘ دو الگ چیزیں ہیں۔ اقبالؔ کے چند اشعار تو بچّے بھی سمجھ لیتے ہیں، بلکہ بینڈ بجانے والے وہ افراد بھی سمجھ لیتے ہیں جو بڑے آہنگ کے ساتھ ’’سارے جہاں سے اچھا‘‘ کی دھن الاپتے ہیں۔ اصل مسئلہ ہے اقبالؔ کی فکر کو سمجھنے کا، ورنہ وہی غلط بات بار بار دہرائی جاتی رہیگی کہ، ’’اقبالؔ نے پاکستان کا نقشہ بنایا تھا‘‘ ...... ’’اقبالؔ تصورِ پاکستان کے خالق اور داعی ہیں‘‘ ...... صرف اتنا ہی نہیں بلکہ نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ غیر مسلم یہ کہتے ہوئے پائے گئے کہ ’’اقبالؔ پاکستان کیوں چلے گئے؟‘‘ حالانکہ اقبالؔ کا وصال قیامِ پاکستان سے دس سال پہلے ہی ۱۹۳۸ء میں ہو چکا تھا۔

یہاں گفتگو چونکہ اقبالؔ کے فارسی کلام سے متعلق ہو رہی ہے، اس لیے انگریزی کا تذکرہ ضروری نہیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اقبالؔ کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے ان کی انگریزی تصانیف کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ یہ امر اپنے آپ میں ایک بھرپور مقالے کا متقاضی ہے اس لیے سرِ دست اس موضوع کی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے صرف اتنا ذہن نشین کرا دیں کہ اقبالؔ کی انگریزی تصانیف فارسی سے بھی متجاوز ہیں۔

امتحان کا خوف دراصل امتحان سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔ یقیناً فارسی کا خوف فارسی سے زیادہ شدید نہیں ہونا چاہیے۔ فارسی زبان اتنی آسان ہے کہ اسے ایران کے بچے

بھی بولتے ہیں۔ ظاہر ہے بچے وہی زبان بولتے ہیں جو آسان ہو، اور یاد رکھیے جو زبان بچے نہیں بولتے وہ زبان مرجاتی ہے۔ جیسے مصر میں کاہنوں کی افلاطونی زبان ''ڈیموقیطی'' جسے صرف مذہبی بقراط ہی بولتے تھے اور ایک منصوبہ بند طریقے سے انھوں نے اس زبان کو عوام تک پہنچنے نہیں دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مذہبی پیشوائی نظام ختم ہوا تو ان کے ساتھ زبان بھی رخصت ہوگئی.................. آج جب مصر کے اہراموں اور کھنڈرات سے فرعونی لاشیں اور نوادرات برآمد ہوتے ہیں تو ان پر لکھی ہوئی تحریریں پڑھنے والا کوئی نہیں ملتا۔

ایک انداز کے مطابق فارسی زبان، دنیا کی آسان ترین زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس زبان کے چالیس فیصد سے زیادہ الفاظ اردو میں مستعمل ہیں۔ ذرا سی بہتر اُردو پڑھا ہوا شخص، تھوڑی سی محنت کے بعد صرف اقبالؔ ہی نہیں بلکہ کسی بھی شاعر و ادیب کی فارسی دنیا کی سیر کرسکتا ہے۔ اقبالؔ کے فارسی کلام میں سے ایک مختصر بحر کھنے والی نظم نمونتہً پیش ہے، سہولت کے لیے اس کا آزاد ترجمہ لکھ دیا گیا ہے۔ نظم کا عنوان ہے، '' فصلِ بہار '' ملاحظہ فرمائیں :

فصلِ بہار

خیز کہ در کوہ و دشت، خیمہ زد ابرِ بہار
مستِ ترنّم ہزار
طوطی و درّاج و سار
بر طرفِ جوئبار
کِشتِ گل و لالہ زار
چشمِ تماشا بیار
خیز کہ در کوہ و دشت، خیمہ زد ابرِ بہار

☆

خیزکہ در باغ و راغ، قافلۂ گل رسید

باد بہاران وزید

مرغ نوا آفرید

لالہ گریبان درید

حسن گلِ تازہ چید

عشق غمِ نو خرید

خیزکہ در باغ و راغ، قافلۂ گل رسید

☆

بُلبُلگان در صفیر، صُلصُلگان در خروش

خونِ چمن گرم جوش

ای کہ نشینی خموش

درشکن آئینِ ہوش

بادۂ معنی بنوش

نغمہ سرا، گل بپوش

بُلبُلگان در صفیر، صُلصُلگان در خروش

☆

حجرہ نشینی گذار، گوشۂ صحرا گزین

بر لبِ جُوئی نشین

آبِ روان را ببین

نرگسِ ناز آفرین

لختِ دلِ فرودین

بوسہ زنش بر جبین

حجرہ نشینی گذار، گوشۂ صحرا گزین

☆

دیدۂ معنی گشا، اے زعَیان بے خبر

لالہ کمر در کمر

نیمۂ آتش بہ بر

می چکدش بر جگر

شبنمِ اشکِ سحر

در شَفق انجم نگر

دیدۂ معنی گشا، اے زعیان بے خبر

☆

خاکِ چمن وا نمود، رازِ دلِ کائنات

بود و نبودِ صفات

جلوہ گر یہائے ذات

آنچہ تو دانی حیات

آنچہ تو خوانی ممات

ہیچ ندارد ثبات

خاکِ چمن وا نمود، رازِ دلِ کائنات

(فصلِ بہار : پیامِ مشرق)

[ترجمہ : اٹھ! اور دیکھ کہ جنگلوں اور پہاڑوں میں موسمِ بہار نے اپنے خیمے گاڑ دیے ہیں۔ عندلیبوں، طوطوں، تیتروں اور خوبصورت گرسلوں نے نغمے چھیڑ رکھے ہیں۔ ندی کی جانب گلاب اور لالے کے پھولوں کے تختے اُگ آئے ہیں۔ انھیں جی بھر کے دیکھ۔ اٹھ اور دیکھ کہ جنگلوں اور پہاڑوں میں موسمِ بہار نے اپنے خیمے گاڑ دیے ہیں۔

دیکھ کہ باغوں اور جنگلوں میں پھولوں کے قافلے آپہنچے ہیں۔ بہار کی ہوائیں چل رہی ہیں، پرندے نغمے الاپ رہے ہیں۔ لالے کے سرخ سرخ پھولوں نے اپنے گریبان چاک کرڈالے ہیں، حسن نے تازہ گلاب اور پھول چن لیے ہیں۔ یہ موسم ہے عشق کے لیے نئے غم خریدنے کا۔ اٹھ! کہ باغوں اور جنگلوں میں پھولوں کے قافلے آپہنچے ہیں۔

بلبل چہک رہے ہیں، فاختائیں پھدک رہی ہیں۔ چمن کا رنگ اُبال پر ہے۔ تو کیا خاموش پڑا ہے، اپنے ہوش وحواس کو لپیٹے ہوئے، بیخود ہو اور فطرت کی شراب پی کر مدہوش ہو جا، نغمے الاپ اور پھولوں سے اپنا جسم ڈھنک لے۔ دیکھ کہ باغوں میں بلبل چہک رہے ہیں اور فاختائیں بول رہی ہیں۔

بند مکان کی قید سے آزاد ہو اور جنگلوں کا رُخ کر۔ دریا کے کنارے بیٹھ، بہتے ابلتے پانی کو دیکھ، نرگس کے پھولوں کی اٹھکیلیوں کو محسوس کر، دیکھ کہ موسمِ بہار کا پہلا مہینہ، کس طرح اس کی پیشانی کو چومتا ہے۔ چھوڑ! اپنی خانہ نشینی کو چھوڑ اور جنگل کی راہ لے۔

عقل کی آنکھیں کھول کہ تو حقیقتوں سے بے خبر ہے۔ لالے کے پھول کمر کمر اُگ آئے ہیں۔ گویا اُنھوں نے اپنے ہاتھوں میں آگ کے بلّم تھام رکھے ہیں اور ابھی وہ جگر کے پار ہوں گے۔ صبح کے دھندلکوں میں شبنم کے آنسو دیکھ کہ وہ شفق کے اجالوں میں تاروں کی طرح چمکتے ہیں۔ اپنی عقل کے پٹ کھول اور حقیقتوں سے واقف ہو۔

باغ کی مٹی نے کائنات کے دل کا راز اُگل دیا ہے۔ جلوۂ خداوندی اپنی تمامتر رعنائیوں اور خصوصیتوں کے ساتھ آن موجود ہوا ہے۔ زندگی کی جن حقیقتوں سے تو واقف ہے اور موت کی جن سچائیوں کو تو جانتا ہے۔ یاد رکھ کہ اِن میں سے کسی کو ثبات نہیں! دیکھ! کہ باغ کی مٹی نے کائنات کے دل کا راز کھول دیا ہے۔]

نظم کے لفظی ترجمے سے پرہیز کیا گیا ہے۔ اس پوری نظم میں منظر کشی محض رسماً کی گئی ہے۔ اقبالؔ کا اصل مقصد تو اس اشتہار زنی کی معرفت قاری کو آخری بند تک لانا ہے۔ وہ نا امید دلوں کو جوش دلانا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ افرادِ ملّت فلسفیوں کی طرح بے سُدھ ہو کر اپنے حجروں میں پڑے نہ رہیں، بلکہ زندگی کی سچائیوں کو قریب سے دیکھیں۔ انھیں جانچیں، پرکھیں۔ زندگی اور موت دونوں کو اس کائنات میں ثبات نہیں ہے۔ قیامت میں ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب موت کی موت واقع ہو جائے گی۔

بقا کو جو دیکھا، فنا ہوگئی وہ
قضا تھی شکارِ قضا ہوگئی وہ

اپنی بات ختم کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ اقبالؔ کی ایک اور چھوٹی سی نظم آپ کو سنا دی جائے، جس میں حرکت ہے، عمل ہے، زندگی کی روانی ہے۔ یہ دراصل وہی روایتی نغمہ ہے جسے لق ودق صحرا پار کرتے ہوئے اونٹوں کے قافلے کو ہانکتے ہوئے گایا جاتا ہے، جس کی لَے سے سرشار ہو کر اونٹوں کی تھکن دور ہوتی ہے اور وہ مَست ہو کر تیز تیز قدم اپنی منزل کی جانب بڑھانے لگتے ہیں۔ یہ گیت فارسی میں ہے۔ عربی میں گائے جانے والے گیت ''حُدی'' کہلاتے ہیں اور گانے والے کو ''حُدی خواں'' کہتے ہیں۔ اقبالؔ نے یہ گیت فارسی میں تحریر کیا ہے :

’’حُدی‘‘

(نغمۂ سار بانِ حجاز)

[حجاز کے اونٹ بانوں کا گیت]

ناقۂ سیّارِ من
آھوئے تاتارِ من
درھم و دینارِ من
اندك و بسیارِ من
دولتِ بیدارِ من
تیز ترک گام زن، منزلِ ما دور نیست

☆

دلکش و زیباستی
شاھدِ رعنا ستی
روکشِ حوراستی
غیرتِ لیلاستی
دخترِ صحرا ستی
تیز ترک گام زن، منزلِ مادور نیست

☆

در تپشِ آفتاب
غوطہ زنی در سراب
ھم بہ شبی ماھتاب

تند روی چوں شہاب

چشمِ تو نادیدہ خواب

تیز ترک گامزن، منزلِ ما دور نیست

☆

لکّۂ ابرِ روان

کشتئ بے بادبان

مثلِ خضر راہ دان

بر تو سبک ہر گران

لختِ دلِ ساربان

تیز ترک گامزن، منزلِ ما دور نیست

☆

سوزِ تو اندر زمام

سازِ تو اندر خرام

بی خورش و تشنہ کام

پابہ سفر صبح و شام

خستہ شوی از مقام

تیز ترک گامزن، منزلِ ما دور نیست

☆

شامِ تو اندر یمن

صبح تو اندر قرن

ریگِ درشتِ وطن
پائے ترا یاسمن
اے چو غزالِ ختن
تیز ترک گامزن، منزلِ ما دور نیست

☆

مہ زسفر پاکشید
در پسِ تل آرمید
صبح زمشرق دمید
جامۂ شب بردرید
بادِ بیابان وزید
تیز ترک گامزن، منزلِ ما دور نیست

☆

نغمۂ من دلگشای
زیر و بمش جانفزای
قافلہ ھا را درای
فتنہ ربا فتنہ زای
ای بہ حرم چہرہ سای
تیز ترک گامزن، منزلِ ما دورنیست

☆

ترجمہ: اے میری چنچل اونٹنی، اے میری تاتاری ہرن، اے میری دولت، اے میری

نفع ونقصان، اے میری زندہ دولت؛ اٹھا! اپنے قدم تیز اٹھا، دیکھ اب اپنی منزل زیادہ دور نہیں۔

تو کتنی حسین و دلکش ہے، تو میری محبوبہ ہے، تیرے سامنے تو حُور بھی شرما جائے، لیلیٰ بھی تجھ پر ناز کرے۔ تو تو ریگستان کی بیٹی ہے۔اپنے قدموں کو تیز تر کر کہ اپنی منزل اَب زیادہ دور نہیں۔

سورج کی کڑی دھوپ میں، تو سرابوں میں غوطہ لگاتی ہے اور چاندنی راتوں میں، تو یوں چلتی ہے، جیسے فلک سے کوئی تارہ ٹوٹ کر رواں ہو اور تیری آنکھوں میں دوُر دوُر تک نیند کا پتہ نہیں ہوتا۔ چل! اپنی چال تیز تر کر کہ اب ہماری منزل بہت قریب ہے۔

تیری چال بادلوں جیسی ہے، گویا بے بادبانوں کی کشتی ہو، حضرت خضرؑ کی طرح تو بھی راستوں سے واقف ہے، ہر بوجھ تجھ پر ہلکا ہے، تو میرے دل کا ٹکڑا ہے، اپنے قدم جلدی اٹھا کہ اب اپنی منزل زیادہ دور نہیں۔

تیری لگام میں بڑی تڑپ ہے، تیری چال میں موسیقی ہے، بغیر کچھ کھائے پیے، تیرا سفر صبح و شام جاری ہے، قیام تجھ پر گراں ہے۔۔۔اپنے قدم بڑھا! کہ اَب اپنی منزل زیادہ دور نہیں۔

تیری شام کبھی یمن میں ہے تو صبح کبھی ریت کے ہلالی ٹیلوں کے سائے میں ہے، اپنے وطن کی ریت گو کہ بہت سخت ہے لیکن تیرے پیر تو چنبیلی کے پھول ہیں، اے میری ترکستانی ہرن! اپنے قدموں کو تیز تر کر دے کہ دیکھ، اب اپنی منزل زیادہ دور نہیں ہے۔

چاند اپنے سفر سے تھک کر پہاڑوں کی اوٹ میں آرام کرنے چلا گیا، صبح مشرق سے نمودار ہوئی، اس نے رات کا پیرہن چاک کر ڈالا، دیکھ! وہ صبح کی ٹھنڈی ہوا چلی۔ اٹھا! اپنے پیروں کو تیز کر دے کہ اب اپنی منزل زیادہ دور نہیں۔

میرا نغمہ دلوں کی تاروں کو جھنجوڑتا ہے، اس کا اتار چڑھاؤ بڑا خوش کن ہے، یہ قافلے کے لیے گھنٹے (جرس) کا کام دے رہا ہے، یہ فتنے جھیلتا اور نئے فتنے جگاتا ہے، دیکھ ! کہ تیرا چہرہ اب حرم کے سامنے ہے۔ چل! تیز تر چل کہ اب اپنی منزل آ پہنچی ہے۔

☆☆☆

اقبالؔ کا فارسی کلام ایک پوری دنیا ہی نہیں بلکہ ایک پوری کائنات ہے۔ اس کا مطالعہ بہت زیادہ مشکل بھی نہیں، بس ذرا ہمت کر کے قدم تیز کرنے کی ضرورت ہے۔ ترجمہ ایک عارضی عمل ہے۔ اس میں پھول کی شکل تو بنتی ہے لیکن اس کی خوشبو غائب ہو جاتی ہے۔ آپ اصل خوشبو تک پہنچنے کی سعی کریں۔

□□□

پیامِ مشرق میں شامل "مئے باقی" (حصہ غزلیات) کی پہلی غزل کا مسودہ ڈاکٹر علامہ اقبال کے قلم سے۔

کلامِ اقبالؔ میں تاریخ بیانی کا ادبی تناظر

بقول مولانا عبدالسلام ندوی، ''اقبالؔ کو فلسفہ سے چڑھ تھی۔ اور وہ اپنے آپ کو کبھی بھی فلسفی کہلانا پسند نہیں کرتے تھے۔'' تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبالؔ اپنے آپ کو کیا کہلواتے تھے؟ پروفیسر، بیرسٹر، عاشق، زاہد، رند، محرمِ رازِ درونِ میخانہ، قمریٔ شمشادِ معانی، رشکِ کلیمِ ہمدانی، تشیّع پسند، مجموعۂ اضداد، دفترِ حکمت، خفقانیٔ طبع، آگاہِ شریعت، کافرِ ہندی، منصور کا ثانی، یا پھر یہ کہ، ''اقبالؔ بھی خود اپنے آپ سے آگاہ نہیں تھے؟''

شاعری کوئی مسلسل تصنیف نہیں ہوتی کہ آپ اس کے آنچل میں تاریخی واقعات کو سلمیٰ ستاروں کی طرح ٹانکتے چلے جائیں اور تزئین کاری کے لیے حواشی وحوالہ جات کا گوٹے ٹھپّے کی طرح استعمال کریں۔ اقبالؔ الفاظ کے استعمال میں نہایت ذکی الحس واقع ہوئے تھے۔ جہاں چٹکی بھر لفظوں سے کام چلتا تھا وہاں انھوں نے مٹھی بھر لفظوں کا استعمال کبھی نہیں کیا۔ مثلاً ایک شعر میں رِدا کے لیے وہ تین لفظ لائے ہیں۔ اتنی چابکدستی سے کہ یوں محسوس ہوتا ہے گویا ہر لفظ کو صرف اسی مصرعے کے لیے وجود بخشا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

یہی پیرِ حرم ہے جو چُرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرو دلقِ اویس و چادرِ زہرا

چنانچہ حضرت زہراؓ کے سامنے سے اگر ہم چادر کا لفظ ہٹا کر دِلق یا گلیم یا بُردہ کا لفظ رکھ دیں تو لگتا ہے جیسے کسی بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کر بیٹھیں گے۔

تلمیحات، شاعر کے حق میں نیوکلیائی طاقت کا حکم رکھتی ہیں۔ اقبال کا سب سے بڑا

کمال یہ ہے کہ انھوں نے تلمیحات کا وافر استعمال کیا ہے۔ لیکن تلمیحات کے استعمال میں وہ الفاظ کے انتخاب سے بھی زیادہ حساس واقع ہوئے ہیں۔ انھوں نے اساطیری واقعات کو کم اور تاریخی واقعات کو زیادہ نظم کیا ہے۔ اس سے دو باتیں ہوئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ادب میں ان کی تاریخ دانی کی دھاک بیٹھ گئی اور کلام مستحکم ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ قاری کو تاریخ کے صفحات الٹنے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔

مسلمانوں نے تاریخ کو قصص واساطیر کے تحیّر خانوں، عیسائی واسرائیلی روایات کے شکنجوں اور مشرقی دیومالائیت کی دلدل سے نکال کر اس کے پیروں تلے سچ مچ کی زمین عطا کی ہے۔ علاّمہ اقبالؔ نے یہی تاریخ پڑھی تھی اور یہی تاریخ اورینٹل کالج میں پڑھائی بھی تھی۔ یورپ کے طول طویل قیام میں انھوں نے وہاں کے کتب خانوں میں علم کے انھیں موتیوں کو دیکھ کر انھوں نے اپنا دل سی پارہ کیا تھا۔ ڈاکٹر اقبالؔ کو اُن کے اپنے دَور کے ذہین ترین انسانوں میں شمار کیا جانا چاہیے۔ انھیں سب سے زیادہ قدرت انگریزی زبان پر تھی۔ پھر بالترتیب اردو، فارسی اور عربی پر۔ یورپ کے قیام کے دوران انھوں نے جرمن زبان کی شناخت سے اپنے منہ کا مزہ بدلا تھا۔ فرانسیسی اور اسپینی تہذیب کو انھوں نے قریب سے دیکھا تھا اور ان زبانوں کے برتنے والوں کو برتا تھا۔ ادھر پنجابی، ہندی اور سنسکرت اُن کے بالکل بچپن کی چیزیں تھیں۔ اس لیے یہ بات دعوے کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اقبالؔ تاریخِ عالم کے مطالعے کے لیے اس کی اصل زبان میں اس کے اوریجنل مواد تک پہنچے تھے۔ تاریخ اور فلسفہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ چنانچہ فنِ تاریخ کے میدانِ کرب وبلا سے گذرے بغیر فلسفے کا شہیدِ ناز بننا ممکن نہیں۔

اقبالؔ نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ مسلمانوں کے لیے سارے عالم میں ہلاکت آفریں دور تھا۔ اور اقبالؔ کے ممدوح کو کہنا پڑا تھا کہ ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دُعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

(حالی)

چنانچہ اقبال عالمِ اسلام کے گونا گوں مسائل کا مداوا اسلامی تاریخ میں تلاش کرتے ہیں اور بے تاب ہو کر کہہ اٹھتے ہیں کہ ؎

ہاں دکھا دے اے تصوّر پھر وہ صبح و شام تو
لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

انھوں نے نہایت چابک دستی سے مِلّت اسلامیہ کا رشتہ اپنی تاریخ بیانی کے ذریعہ اس کے ماضی سے جوڑا ہے۔ یہاں تلمیحات ان کے بڑے کام آئی ہیں۔ چنانچہ وہ تلمیحات میں عصائے موسیٰؑ سے زیادہ ضربِ کلیمی پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ آتشِ نمرود کی مفصلات میں پڑنے کی بجائے عشقِ براہیمیؑ پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ وہ اسمٰعیلؑ کو محض ایک فرزندِ ارجمند نہیں بلکہ آدابِ فرزندی کی علامت سمجھتے ہیں۔

اپنے کلام میں تاریخ نگاری اور واقعات کو نظم کرنے کے معاملے میں وہ نہایت محتاط تھے۔ سوامی رام تیرتھ ان کے ہمعصر اور بے تکلف دوست تھے۔ ان کے مریدین ان کی خاکِ پا کو آنکھوں سے لگاتے اور مانگ میں بھرتے تھے۔ سوامی جی آریہ سماجی اور کٹر برہمہ چاری تھے لیکن اس کے باوجود ایک امریکی خاتون سے پیدا ہونے والے بچے کے باپ بھی تھے۔ لیکن اپنی نظم میں جو ''سوامی رام تیرتھ'' کے نام سے بانگِ درا میں موجود ہے، اقبال نے اِن واقعات کی پردہ پوشی کی ہے اور سوامی جی کے تقدّس کو برقرار رکھتے ہوئے، ''دریائے راوی میں ان کے ڈوب جانے (خودکشی) کے واقعے کو نہایت خوبصورتی سے فلسفۂ وحدت الوجود کی طرف موڑا ہے۔'' اور یہ کہہ رہا ہے کہ ؎

نفیِ ہستی اِک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
'لا' کے دریا میں نہاں موتی ہے اِلاّ اللہ کا

اُن کی اُردو کُلّیات میں ایک اور نظم ''رام'' کے عنوان سے ملتی ہے۔ یہ نظم اُن کی نوعمری کی نہیں بلکہ انگلستان سے لوٹے ہوئے ایک پختہ کار بیرسٹر کے قلم سے نکلی ہوئی ہے۔ ''رام'' کا نام آتے ہی ذہن فوراً ''رامائن'' کی طرف جاتا ہے جو کہ اپنے آپ میں ایک اساطیری اور دیومالائی تخلیق تصور کی جاتی ہے۔ اقبالؔ کی تاریخ بیانی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے پوری نظم میں کہیں رامائن کا ذکر تک نہیں کیا ہے۔ بلکہ اپنے ممدوح کو ''ہند کا امام'' تسلیم کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ بھارت کے نام کو اونچا کرنے میں ایسے ہزار ہا ہزار فرشتہ صِفت انسانوں کا ہاتھ رہا ہے، جن کے آگے مغرب کے فلسفیوں نے اپنے سَر خَم کیے ہیں۔ یعنی اس نظم میں دراصل وہ اُس ''حقیقی رام کی تعریف کر رہے ہیں جس کی شہرت اور نیک نامی سے متاثر ہو کر شاید دشرتھ نے اپنے بیٹے کا نام اُسی ''رام'' کے نام پر ''رام'' رکھا تھا۔

اقبالؔ کی تقریباً ہر نظم کی کوئی نہ کوئی شانِ نزول ہے۔ اقبالؔ کے کلام میں آپ سیرت و مغازی بھی پائیں گے اور ایّام و انساب بھی۔ ان کی نظمیں فتح و احداث سے لے کر تو تاریخ مدن کی امین ہیں۔ انھوں نے اپنے اردو اور فارسی کلام کے ذریعہ عالم اسلام کو ایسی ایسی اجنبی شخصیتوں سے متعارف کروایا ہے جو غیر شعوری طور پر اسلامی تاریخ کا جز بن گئیں اور بعض تاریخی شخصیتوں پر یا تو ضرب لگائی یا مدح و توصیف کی ہے کہ وہ بالترتیب عبرت یا تقلید کا سرمایہ بن گئیں۔ نیٹشے، برگساں، گوئٹے، سپنوزا، سٹنڈل، سوامی رام تیرتھ، بھرتری ہری، معرّی، لطف اللہ آزر، کومٹ اگسٹس، بوڈن اسٹاٹ، ضیغم لولابی، لاک، ہورن پال، مہدی سوڈانی، ہائینا، فان ہیمر، ہرڈر، ہرمن اسٹال، بُصیری، دیلمی، ڈومر، برونو،۔۔۔ غرض کوئی کہاں تک گنوائے۔ اقبالؔ نے اپنے کلام میں ان کا ذکر کر کے ''یار زندہ صحبت باقی''

کے مصداق ان سب کو تاریخ کا جز بنادیا اور آنے والے ماہرین اور شارحین اقبالیات کے لیے ایک مستقل موضوعِ تحقیق کو وجود بخشا ہے۔ مسجدِ قرطبہ پہلے سے موجود تھی اسی طرح تاریخ میں سومنات کی بھی اپنی شناخت تھی لیکن دل پر ہاتھ رکھ کر کہیے کہ ''یہ عالم، یہ بُت خانۂ شش جہات؛ اُسی نے تراشا ہے یہ سومنات'' کہہ کر اور ''آباء مرے لاتی و مناتی میں اصل کا سومناتی'' تسلیم کرکے ''سومنات'' کے معنیٰ کو اقبالؔ نے آسمان گیر بنایا ہے یا نہیں؟ مسجدِ قرطبہ اُتاریخِ ہسپانیہ کے اوراق میں گم تھی۔ اسے اقبالؔ نے اندلُس کی سرزمین سے نکال کر مسلمانوں کے دل کی دھڑکن بنا دیا۔ تقریباً یہی کیفیت کوہِ اِضم، ریگِ نواحِ کاظمہ، برگِ نخیل، صحرائے عرب، قافلۂ حجاز، حجازی لے، مٹی کا حرم، اور کافرِ ہندی وغیرہ کی ہے۔

اقبالؔ نے فرانس، جرمنی، اٹلی، اور برطانیہ کے علاوہ افغانستان، فلسطین اور اسپین کا بھی سفر کیا تھا۔ میں ذاتی طور پر سفر کی آخری منزل کو حدِ نظر تک تسلیم کرتا ہوں۔ بلکہ دراصل حدِ سفر، حدِ نظر ہی ہے۔ اس اعتبار سے انھوں نے جہاز کے عرشے سے صقلیہ (جزیرۂ سِسلی) کا بھی نظّارہ کیا تھا، اور تڑپ کر کہا تھا کہ ؎

رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار!

وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار!

اسی طرح اشبیلیہ، الحمراء، غرناطہ، اور قُرطبہ کی سَیر کے دوران معلوم پڑتا ہے کہ ان کا کلیجہ پھٹ جائے گا، اور دل سینے سے اُچھل پڑے گا۔ تاریخِ اندلس مختلف زبانوں میں لکھی گئی ہے۔ لیکن جو اُبال، زور اور تڑپ ان کی شہرہ آفاق نظم ''مسجدِ قرطبہ'' میں ہے اس کے ایک ایک مِصرعے پر بَنیوں کے بہی کھاتوں کی طرح لکھی جانے والی ''تاریخ'' کے ہزاروں ہزار صفحات قربان۔ تاریخ کے بحرِ ذخّار کا غوطہ زن اور فنِ تاریخ کا نبض شناس ہی یہ اشعار کہہ سکتا ہے ؎

آہ وہ مَردانِ حق! وہ عربی شہسوار
حاملِ ''خُلقِ عظیم'' صاحبِ صدق و یقین
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دل، فقر ہے، شاہی نہیں!
جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب
ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں
جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل و گرم اختلاط، سادہ و روشن جبیں
آج بھی اُس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

(مسجدِ قرطبہ)

مسجدِ قرطبہ کی بے اذانی اقبالؔ کے وجود کو کھائے جارہی تھی۔ اُن کی نِگاہوں کے سامنے روم و فرانس، جرمنی، اٹلی اور برطانیہ کے انقلابات کی تاریخ کے اوراق گھوم گئے اور مسجدِ قرطبہ کا مینارِ بلند جو کہ ان کی نظر میں جلوہ گہِ جبرئیلؑ ہے اُس سے مخاطب ہو کر اُس وادی کا پتہ پوچھتے ہیں جہاں سے عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں ابھی یورپ میں داخل ہونے کو ہے۔ ذرا اِن اشعار کی ادبیّتِ ملاحظہ فرمائیں جن میں تاریخ کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے :

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں
آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے؟
عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں!
دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دیں!
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں
حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت
اور ہوئی فکر کی کشتیِ نازک رواں
چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دِگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
مِلّتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذّتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں
روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں!

دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

(مسجدِ قرطبہ)

اندلس کو طارق بن زیاد نے ۷۱۱ء میں فتح کیا تھا۔ طارق کے بارہ ہزار کے لشکر نے راڈرک (رزدریق) کے ایک لاکھ ٹڈی دل کا مقابلہ کیا تھا اور یورپ کے اس جنوب مغربی ملک میں اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ طارق کا یہ لشکر تقریباً ۲۰ رکلومیٹر چوڑی آبنائے کو پار کر کے اندلس میں داخل ہوا تھا اور جس چٹان پر کھڑے ہو کر اس نے اپنی فوجوں سے کہا تھا :

"العدو امامکم والبحر وراء کم فاین المفر"

(دشمن تمھارے سامنے ہے اور سمندر ہمارے پیچھے، اب راہِ فرار کہاں؟)

یہ چٹان آج بھی جبل الطارق (Gibraltar Rock) کے نام سے جانی جاتی ہے اور یورپ کے روزمرّہ میں ''کشتیاں جلا دینا'' محاورہ بن چکا ہے۔ تاریخِ ہسپانیہ کے اس واقعے کے ذکر کے بغیر کوئی مورّخ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ڈاکٹر اقبالؔ نے اس پورے تاریخی پس منظر کو ''پیامِ مشرق'' میں صرف تین اشعار میں قلمبند کیا ہے۔ ایجاز و اختصار کی یہ کیفیت کسی ادیب میں صرف تاریخ کے مطالعے سے ہی پیدا نہیں ہوتی بلکہ یہ اسی شخص کا حصہ ہے جس کی نظر قرآنِ کریم کی تاریخ بیانی پر گہری ہو۔ فارسی کے یہ اشعار سنیے ان میں آپ کو سورۂ یوسفؑ کی سی مختصر بیانی کا لطف آ جائے گا :

طارق چو برکنارۂ اندلس سفینہ سوخت گفتند ''کارِ تو، بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن باز چو رسیم؟ ترکِ سبب زروئے شریعت کجا رواست؟''

خندید و دستِ خویش بشمشیر بُرد و گفت
''ہر مُلک مِلکِ ماست، مُلکِ خدائے ماست''

(الملک للہ)

[ترجمہ : طارق نے جب اندلس (اسپین) کے کنارے پر (اپنی فوجوں کو) کشتیاں جلانے کا حکم دیا (تو اُس کی فوج میں موجود مفتیانِ کرام اور علماء نے) اُس سے کہا کہ ''تیرا کام ازروئے عقل بہت بڑی غلطی ہے۔ ہم اپنے وطن سے دور ہیں، واپس کیسے جائیں گے؟ اور شریعت کی رُو سے بھی اسباب کو ضائع کر دینا کہاں جائز ہے؟'' (یہ سُن کر طارق بن زیاد نے) مسکرا کر اپنا ہاتھ تلوار کے (قبضے) پر رکھا اور کہا کہ، ''ہر ملک ہمارا ہے (یہاں تک کہ) خدا کی پوری زمین ہماری ملکیت ہے!'']

ہمیں اقبالؔ کا احسان مند ہونا چاہیے کہ انھوں نے عالمی تاریخ کے چیدہ چیدہ واقعات کو منتخب کیا اور ان پر ادبیت کا غازہ چڑھایا۔ وہ انسانی مسائل کے حل کے لیے تاریخی واقعات کو شہادت کے طور پر لائے ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران جب 'ترک ناداں' اپنی خلافت کی قبا چاک کر رہے تھے، اُسی وقت طرابلس کے میدان میں فاطمہ بنت عبداللہ نامی ایک معصوم عرب لڑکی زخمیوں کو پانی پلاتی ہوئی جامِ شہادت نوش کر رہی تھی۔ اس کے بے تیغ و سپر جہاد کو اقبالؔ نے جس انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے وہ ان ہی کا حق ہے :

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی! ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی!

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

اسلامی تاریخ، شوقِ شہادت، لاثانی بہادری، اور جذبۂ جہاد کے درجنوں واقعات اقبالؔ نے ایک مشاق تاریخ نگار کی حیثیت سے تحریر کیے ہیں۔ ''جنگِ یرموک'' کے دوران

حضرت ابو عبیدہؓ کے سامنے ایک نوجوان کا اپنے آپ کو شہادت کے لیے پیش کرنا کہ حضورِ رسالتمابؐ میں پہنچنے کے لیے بیتاب ہوں مجھے رخصت پیکار دیجیے، ''محاصرۂ ادرنہ'' کے دوران امیرِ فوج کا اپنے سپاہیوں کو ذمیوں کا مال لوٹ لینے کا حکم دینا لیکن امیرِ شریعت کے فتویٰ کے آتے ہی سپاہیوں کا اس مال سے فوراً دست کشی اختیار کر لینا اور لوٹ پر بھوک کو ترجیح دینا ایسے زبردست تاریخی واقعات ہیں جنھیں اقبال نے کمال کی شاعرانہ ندرت اور حسین لفظیات کے ساتھ پیش کیا ہے کہ وہ قاری کے دل میں گھر کر جاتے ہیں۔ اپنے اشعار کے ذریعے انھوں نے ثابت کیا ہے کہ ایشیا والے سکندر کے نام اور کام کو جانتے تک نہیں، لیکن حضرتِ بلالؓ کا نام بچے بچے کی زبان پر ہے۔

اپنی بات ختم کرنے سے پہلے ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک تاریخی واقعے کو جو متعدّد احادیث میں مروی ہے، ڈاکٹر اقبال کی زبانی خراجِ عقیدت کے طور پر آپ کے سامنے پیش کروں۔ غزوَہ تبوک ۸ھ کا مشہور واقعہ ہے کہ ثانیٔ اسلام وغار و بدر و قبر حضرتِ ابو بکر صدیقؓ نے اپنا کل اثاثہ جنگ کی تیاری کے لیے حضورؐ کے قدموں میں لا کر ڈھیر کر دیا۔ اس پورے واقعے میں امید وبیم (suspense) اور تعلیق کی ایک ملی جلی اور والہانہ کیفیت ہے۔ اس واقعے کو بہت سارے شعراء اور ادباء نے نقل کیا ہے۔ یہاں تقابل کا وقت نہیں۔ ہاں البتہ حضراتِ شیخین یعنی حضرت عمرؓ اور صدیق اکبرؓ کے درمیان مقابلہ ضرور ہے، جب حضرت عمرؓ اپنا آدھا مال لے آئے تھے، اس امید پر کہ آج تو میں حضرت ابو بکرؓ سے بازی لے جاؤں گا۔ ہم نظم کا صرف نصف آخر تبرّک کے طور پر آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ نظم کے قوافی، لفظیات، حشو و زوائد سے اجتناب، نفس مضمون پر جلدی آنا اور واقعہ پر ادبی گرفت ڈاکٹر اقبال کی ایسی دلآویز کیفیات ہیں جو پڑھنے والے کو تڑپائے بغیر نہیں رہ سکتیں۔۔

حضرت عمرؓ اپنا آدھا مال حضرت رسالت پناہؐ میں گذران کر کہہ رہے ہیں :

کی عرض نصف مال ہے فرزند و زن کا حق
باقی جو ہے وہ مِلّتِ بیضا پہ ہے نثار

اب دیکھیے تاریخ کے ادبی صفحات پر اقبالؔ حضرت ابوبکرؓ کو کس انداز میں پیش کرتے ہیں ؛

اتنے میں وہ رفیقِ نبوّت بھی آ گیا ۔ جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار
لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت ۔ ہر چیز، جس سے چشم جہاں میں ہو اعتبار
ملک یمین و درہم و دینار و رخت وجنس ۔ اسپ قمر سُم و شتر و قاطر و حمار
بولے حضورؐ ''چاہیے فکرِ عیال بھی'' ۔ کہنے لگا وہ عشق و محبت کا رازدار
''اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر ۔ اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار
پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس
صِدّیق کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس''

(صدیقؓ)

□□□

اقبالؔ کا تصوّرِ شاہین

[یہ مقالہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے زیرِ اہتمام منعقدہ ایک سیمینار ''فلسفۂ اقبالؔ اور دورِ حاضر'' کے تحت مورخہ ۷/اگست ۱۹۹۹ء کو عروسِ دکن پونہ میں ایک موٴقر مجلس کے سامنے پونہ کالج کے آڈیٹوریم میں پڑھا گیا]

عالمی ادبیات میں پرندوں کا تذکرہ کچھ نیا نہیں۔ رامائن جیسی قدیم دیومالائی تصنیف سے لے کر شیکسپئر اور کیٹس جیسے شاعروں تک نے پرندوں کو، اپنے جامد تصورات کو ایک جہانِ معنی پہنانے کے لیے استعمال کیا ہے۔ رامائن میں جٹایو (گروڈا)، شیکسپئر کی شاعری میں Phoenix اور Keats کی شاعری میں Nightingale ایک مستقل کردار کے حامل رہے ہیں۔

ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ شاہین کا تصور خالصتہً مشرقی ہے۔ آج سے تقریباً ساڑھے چار ہزار سال پہلے نمرود نے حضرت ابراہیمؑ کے خدا کو مار ڈالنے کے لیے بھوکے عقابوں کا سہارا لیا تھا اور انھیں اپنے تخت سے باندھ کر پرواز بھری تھی۔

شاہین بازی، شاہین پروری، اور شاہین سرائی، بابل اور ایران کے بادشاہوں اور شاعروں کے خاص مشغلے رہے ہیں اور روم اور پرشیا اور بازنطین کے عیسائی فرمانرواؤں نے صلیبی جنگوں میں اپنی تقدّس مآبی کو دوام بخشنے کے لیے شاہین کو بطورِ شجاعت وہمّت، طاقت و سرعت اور وسعت وہمہ جہتی کی علامت کے طور پر استعمال کیا تھا۔ آج بھی شاہین امریکہ کے جھنڈے اور سکّے کا نشانِ امتیاز ہے اور علاماتی طور پر Phoenix کہلاتا ہے۔ Phoenix

دراصل عربی لفظ فَــقُــنِــسُ کی انگریزی اور ریڈرس انسائیکلوپیڈیا (سیکنڈ ایڈیشن) The Reader's Encyclopedia : II Edition کے مطابق :

"A mythical Arabian bird, the only one of its kind. At the end of certain number of years, it was said to make a nest of spices, sing a melodious dirge, flap its wings to set fire to the pile, consume itself in ashes, but comeforth with new life to repeat the former one."

[ترجمہ : ایک عربی اساطیری (فرضی) پرندہ، جو اپنی مثال آپ ہے۔ برسہابرس گذر جانے پر مصالحہ دار اور معطّر شاخوں سے اپنا آشیانہ بناتا ہے اور نہایت سریلی آواز میں موت کا نغمہ چھیڑ دیتا ہے اور اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتا ہے یہاں تک کہ تیلیاں جل اٹھتی ہیں اور وہ اپنے ہی گھونسلے کی چتا میں جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک مدت گذر جانے کے بعد اسی راکھ سے دوبارہ جی اٹھتا ہے۔]

بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اس اساطیری پرندے کے عربی نژاد ہونے کی ایک اور دلیل یہ بھی ہے کہ پچھلے ہزارے کے نصف آخر سے یورپ کے دواسازوں نے اپنی دوکانوں کی تختیوں پر فَــقُــنِــسُ کی تصویر کو علامت کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا ہے اور یہ کیمیادان آج بھی اپنے آپ کو Alchemists کہتے ہیں اور یہ حقیقت ساری دنیا کو معلوم ہے کہ الکیمیا کے موجد عرب سائنسداں ہیں اور چونکہ یہ پرندہ اپنے آپ کو کیمیا زدہ شاخوں میں جلا کر راکھ کر لیتا ہے اور دوبارہ جی اٹھتا ہے اس لیے یہ تناظر ادویہ اور لافانی حیات کی علامت بن گیا ہے۔ کہتے ہیں فَقُنِس کا عرصۂ حیات ۵۰۰ ربرس سے لے کر ۱۵۰۰ ربرس پر محیط ہوتا ہے۔ شاہین (Eagle) بھی اسی تلمیح کا ایک جزء ہے۔

شاہین اپنی ان تمام تر صفتوں کے باوجود اقبال کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔اس لیے انھوں نے اپنے تخیل کے خزانے سے اسے مزید صفتیں عطا کی ہیں۔ریاضیات کی طرح فلسفے کی بھی کئی گرہیں ہیں۔اور وہ اپنے اصول اور معیار کو ثابت کرنے کے لیے جبر و مقابلے کی طرح کئی منزلیں طے کرتا ہے۔ یعنی جب کسی تصوّر کو ثابت کرنے کے لیے اثبات (Positivity) کا پیمانہ ختم ہو جاتا ہے تو نفی (Negation) یا (Nonentity) کے پاتال کو آسمان کے قلابوں سے ملانا پڑتا ہے اور 'لا' و 'اِلّا' کے سہارے بات آگے بڑھانی پڑتی ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ، شاہین کی عظمت کو ثابت کرنے کے لیے اس کے مقابلے میں کُبک، تدرو، عُصفور، دُرّاج، بلبل، کرگس، کبوتر، تیتر، شپّرک، اُلّو، چکور، زاغ، قُمری، عندلیب، طاؤس اور کوئل جیسے کمزور، گداگر، شاطِر، ناتواں، پست ہمّت، بدذوق، ضعیف، غلام صفت، رنگین، مردار خور، خوشنوا، جاذب نظر اور دِلبر پرندے لائے ہیں۔

فلسفے کا ایک اور عیب یہ ہے کہ وہ 'معلوم' کو 'نامعلوم' اور 'نامعلوم' کو چیستاں بنا دیتا ہے۔اقبالؔ کا خطاب ایک ایسی قوم سے تھا جو ''دو جمع دو چار'' اور ''دو ضرب دو چار'' پر یقین رکھنے کے ساتھ ساتھ ''دو جمع قوسین میں دو تقسیم دو کا جواب تین'' $2 + [2 \div 2] = 3$ کی موجد تھی۔ ہماری مراد الجبراء سے ہے۔اسی قوم نے غزالی، فارابی اور ابنِ تیمیہؒ کو بھی پیدا کیا تھا۔ یہ وہی افراد تھے جنھوں نے مغربی فلسفیوں کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر کے ان کے ہاتھوں سے کتابیں چھین لی تھیں۔یہی وجہ تھی کہ اقبالؔ نے فلسفے کے غیر مرئی اور ماورائی تصورات کو رفاہِ عام کے لیے نامیاتی پیکر عطا کیا تھا۔اگر فلسفے کا مقصد علوئے آدم اور تسخیرِ کائنات ہے تو اقبالؔ بجا طور پر انسانیت کی فلاح کے لیے فاطمہ بنتِ عبداللہ کی شہادت، دلِ مرتضیٰؓ، اسمٰعیل کے آدابِ فرزندی، صدیقؓ سوز، بوئے اسدللہیؓ، ضربِ کلیمیؑ، ٹیپو کی باطل شکنی، طارق بن زیاد کی بے سامانی، عبدالرحمٰن اوّل کی نخیل بانی، رومؔی

اور رازیؔ کی حکمت شناسی اور پھر محمود، شوپن ہار، ایاز، چشتیؒ، رام، نانک، سوامی رام تیرتھ، لولابی، بھرتری ہری اور ایسی ہی لاتعداد شخصیتوں کے احسانمند ہیں جو دراصل کمال انسانیت کی تفسیریں ہیں۔

اقبال صرف شخصیات پر ہی اکتفاء نہیں کرتے بلکہ وہ زندگی کی رمق پائی جانے والی دیگر علامتوں کی تلاش میں بھی رہتے ہیں۔ پھر چاہے وہ مسجدِ قرطبہ ہو یا مسجدِ قوت الاسلام، کاروانِ بہار ہو یا جوئے کہستاں، چاندی ہو یا سونا، پارہ ہو یا آئینہ، اقبالؔ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اپنا پیغام انسانیت کے نام پہنچا ہی دیتے ہیں۔ ذرا یہ اشعار سنیئے ۔

وہ جوئے کہستاں اُچکتی ہوئی اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی
اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رُکے جب تو سِل چیر دیتی ہے یہ پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ
ذرا دیکھ اے ساقیٔ لالہ فام سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

اسی نظم کے یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں :

دمادم رواں ہے یمِ زندگی ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
پسند اس کو تکرار کی خو نہیں کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
چمک اس کی بجلی میں، تارے میں ہے یہ چاندی میں، سونے میں، پارے میں ہے
اسی کے بیاباں، اسی کے ببول اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول
کہیں اس کی طاقت سے کہسار چوُر کہیں اس کے پھندے میں جبریلؑ و حور!
کہیں جُرّہ شاہین سیماب رنگ لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ
کبوتر کہیں آشیانے سے دوُر
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبوُر

(ساقی نامہ : بالِ جبریلؑ)

اقبالؔ کا شاہین بھی اسی طویل اور نہ ختم ہونے والی نامیاتی فہرست کا ایک رکن رکین ہے۔ وہ اقبالؔ کی فکرِ فلک رس کا محض ایک خاموش تماشائی نہیں بلکہ اس طویل سفر کا ایک ساتھی بھی ہے۔ وہ اقبالؔ کا پروردہ ہے لیکن خانہ زاد نہیں، ندیم ہے لیکن غلام نہیں، وفادار ہے لیکن چوکیدار نہیں۔ اقبالؔ کی ہدایت کے مطابق وہ قصرِ سلطانی کے گنبدوں پر آشیانہ نہیں بناتا بلکہ پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرا کرتا ہے۔ مہینوں بھوکا پیاسا رہ جاتا ہے لیکن مردار کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ اُسے شکارِ زندہ کی لذّت نصیب ہے۔ وہ بھی اقبالؔ کی طرح پرندوں کی دنیا کا درویش ہے، وہ زاہد ہے لیکن زاہدِ خشک نہیں، وہ راہب ہے لیکن حیات کی نمو پر یقین رکھتا ہے۔ وہ پرندہ ہے لیکن خیابانیوں سے پرہیز کرتا ہے اسی لیے اپنا آشیانہ نہیں بناتا۔ اقبالؔ نے اسے ''رزق'' کا آفاقی نظام سمجھا دیا ہے کہ رزق صرف آب و دانہ، کھانا پانی، رینک (Rank) اور Pay Scale، رشوت و چاپلوسی یعنی *Livelihood* کے نعرے کے طور پر ''جو کچھ کروں گا پیٹ کے لیے کروں گا اور پیٹ کے سوا کچھ نہ کروں گا'' کا نام نہیں بلکہ یہ ایک روحانی اور کائناتی نظام کا عنوان ہے جو بندوں کو مل کر ہی رہتا ہے۔ انسان کی سماجی، معاشی، تعلیمی، علمی، روحانی اور ہر قسم کی برتری اور ترقی کا نام رزق ہے۔ یہاں تک کہ موت رزق کی اعلیٰ ترین قسم ہے۔ بقول قاری طیب صاحب کہ ''سردیوں میں گرم پانی اور گرمیوں میں ٹھنڈا پانی بھی رزق ہے۔'' اقبالؔ کے شاہین نے اپنے آقا کے رزق کا مطلب سمجھ لیا ہے؛ اس لیے اُسے اس دنیا سے نفرت ہوگئی ہے جہاں انساں، نوعِ انساں کا شکاری اور پیٹ کا پجاری ہے۔ چنانچہ اقبالؔ کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے اس نے خلوتوں کی تلاش میں دور جنگل بیابانوں کی راہ اپنائی ہے۔ فضائی دنیا کا وہ ایک مثالی پرندہ ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ بلا تکلف یہ کہہ بیٹھتے ہیں کہ :

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنّم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

(خضرِ راہ : بانگِ درا)

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرو مایہ کو شاہیں سے لڑا دو

(فرشتوں کا گیت : بالِ جبریل)

کلامِ اقبال میں ''شاہین'' کے عنوان سے ایک مستقل نظم ہے، اس سے قطعِ نظر، ہم چاہتے ہیں کہ شاہینی صفات کو بدرجۂ اتم سمجھ لینے کے لیے آپ مندرجہ ذیل اشعار بھی سنتے چلیں:

گذر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذِلّت ہے کارِ آشیاں
بندی

(غزل ۱۰ : بالِ جبریل)

شاہین، اقبال کو اپنی اولاد کی طرح عزیز ہے۔ اس کی خبر گیری اور دعوتِ کج کلاہی و پاکبازی کے دوران اقبال اپنے بیٹے کا عکس اس میں دیکھتے ہیں :

وہ فریب خوردہ شاہیں، جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

(غزل ۱۳ : بالِ جبریل)

برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر
یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کُلاہ

(غزل ۲۳ : بالِ جبریل)

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

(غزل ۴۰ : بالِ جبریل)

چیتے کا جگر چاہیے، شاہیں کا تجسّس
جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانش و فرہنگ!
کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ!

(غزل ۵۸ : بالِ جبریلؔ)

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے تیری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری تری آنکھوں میں بے باکی نہیں ہے

(رباعیات: بالِ جبریلؔ)

تیرا جوہر ہے نوری، پاک ہے تو فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو

(رباعیات : بالِ جبریلؔ)

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ

(جاوید کے نام : بالِ جبریلؔ)

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

(ایک نوجوان کے نام: بالِ جبریلؔ)

پرواز ہے دونوں کی اُسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

(حال ومقام : بالِ جبریلؔ)

اپنے دسترخوان پر بھُنا ہوا تیتر دیکھ کر عربی کے مشہور شاعر اور فلسفی ابوالعلامعرّی کا Reaction ملاحظہ فرمائیں :

افسوس! صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اِشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

(ابوالعلامعرّی : بالِ جبریلؔ)

اسی لیے وہ نوجوان نسل کو شاہینی تناظر میں تلقین کرتے ہیں کہ :

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دَم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

(اسرارِ پیدا : ضربِ کلیمؔ)

اے جانِ پدر نہیں ہے ممکن
شاہیں سے تدرو کی غلامی

(جاوید سے : ضربِ کلیمؔ)

اب یہ بحث بہت پرانی ہو چکی ہے کہ شاہین کے مزاج میں خونخواری ہے اور وہ اہنسا کا انکاری ہے کیونکہ وہ فضا کے اچھوتوں کا شکار کرتا ہے اور ان کے گرم گرم خون سے اپنی پیاس بجھاتا ہے۔ اب اس کا کیا علاج کہ اقبالؔ کے شاہین کے علاوہ بھی جو عام باز، عقاب یا شِکرے ہیں وہ بھی بین الاقوامی سطح پر فطرتاً گوشت خور (Non-vegitarian) (arnivorous) واقع ہوئے ہیں۔

ہندوستان میں رہنے والے چند مٹھی بھر افراد کی باتوں میں آ کر تو شاہین گھاس کھانے سے رہا۔ جبکہ بھارتی شیر بھی آج تک سبزی خور (Herbivorous) نہ بن سکا۔ ان تمام اصولی بحثوں سے قطع نظر خود اقبالؔ نے معصوم پرندوں پر ٹوٹ پڑنے کے لیے شاہین کی

تخلیق نہیں کی ہے۔ وہ خود اُس کے انکاری ہیں اور کہتے ہیں کہ :

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

(نصیحت : بالِ جبریل)

اور اقبالؔ کی شہرہ آفاق نظم ''شاہین'' کے یہ اشعار :

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں　　کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا　　لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

(شاہین : بالِ جبریل)

ان اشعار کو نقل کر کے ہم یہ بالکل ثابت نہیں کرنا چاہتے کہ اقبالؔ کا شاہین ولی صفت ہے لیکن اتنا ضرور کہنا چاہیں گے کہ وہ تکمیلِ خودی، نفس شناسی، علوئے کردار، قول وفعل کی ہم آہنگی، بے نیازی و یکسوئی اور بلندی و آفاقیت کی جانب ایک مجسّم پیش رفت ہے۔

جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے۔ راقم الحروف اپنی زندگی میں بعض ایسے تدریس اور نصابیاتی تدوین کے تجربات سے گذرا ہے جو شاید ہی کسی کے حصے میں آئے ہوں۔ پرائمری مدارس کے اساتذہ سے لے کر کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ و اساتذہ تک، بھارتی افواج سے لے کر حکومتِ ہند کے اہلکاروں (Bureaucrats) تک؛ متنوع اکیڈمیوں اور تحقیقی اداروں کے فیکلٹی ممبران کے Orientation سے لے کر خالصتاً مذہبی اسلامی اداروں اور عیسائی مشنریوں کے معلّمین و متعلّمین تک کو علومِ اسلامی (Islamic Studies) اور اقدار و اخلاقیات (Values and Ethics) اور ادب کو سبقاً پڑھایا ہے۔ اسلامی اداروں کو چھوڑ کر باقی تمام جگہوں پر شرکاء غیر مسلم رہے ہیں۔ تجرباتی طور پر نصاب میں اقبالؔ کی چند نظمیں شامل کی گئیں۔ دورانِ تدریس جب اقبالؔ کی مشہور نظم ''شاہین'' کو پہلی مرتبہ کلاس روم میں داغا ہے تو یوں محسوس ہوا جیسے ہال میں جذبات اور سرشاری کا ایک سمندر موجیں مار رہا ہو۔ کٹّر پنتھی بھی اُچھل پڑے۔ سو فیصد غیر مسلم شرکاء جو

اقبالؔ کو قیامِ پاکستان کا علمبردار اور اسلامی نشاۃ الثانیہ کا نقیب سمجھتے تھے اور جن کی اقبالؔ شناسی میں ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا، ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا'' سے آگے کچھ نہ تھا یکایک چونک پڑے جیسے انھوں نے ایک نیا عالم دریافت کرلیا ہو۔ کلامِ اقبالؔ کو دیوناگری میں پڑھنے کی فرمائشیں ہونے لگیں اور ہمارے Values & Ethics والے کورسوں کے سارے Paradigm، مصطلحات اور فلسفے دھرے کے دھرے رہ گئے اور سب نے بیک زبان کہا کہ ''اقبالؔ خود کفیل ہے۔ اس کے پاس تو سب کچھ ہے۔'' آج بھی یہ عالم ہے کہ اقبالیات کی کوئی نشست کسی اکیڈمی میں ہوتی ہے تو وہاں پر جاری دوسرے کورسوں کے شرکاء کچھ کر کرا کے ہماری مجلسوں میں آدھمکتے ہیں :

کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

(طلوعِ اسلام : بانگِ درا)

بڑی ناانصافی ہوگی اگر ''شاہین'' آپ کے سامنے پیش نہ کردی جائے۔ ممکن ہے اس وقت کلّیاتِ اقبالؔ آپ کی پہنچ سے دور ہو۔ سن لیجیے، پیش ہے، ''شاہین''

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارا — جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ!
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو — ازل سے فطرت مری راہبانہ!
نہ بادِ بہاری، نہ گلچیں، نہ بلبل — نہ بیماریٔ نغمۂ عاشقانہ!
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم — ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ!
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری — جواں مرد کی ضربتِ غازیانہ!
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں — کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ!

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ!
یہ پُورب، یہ پچھّم، چکوروں کی دنیا مرا نیلگوں آسماں بیکرانہ!
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

(شاہین : بالِ جبریل)

□□□

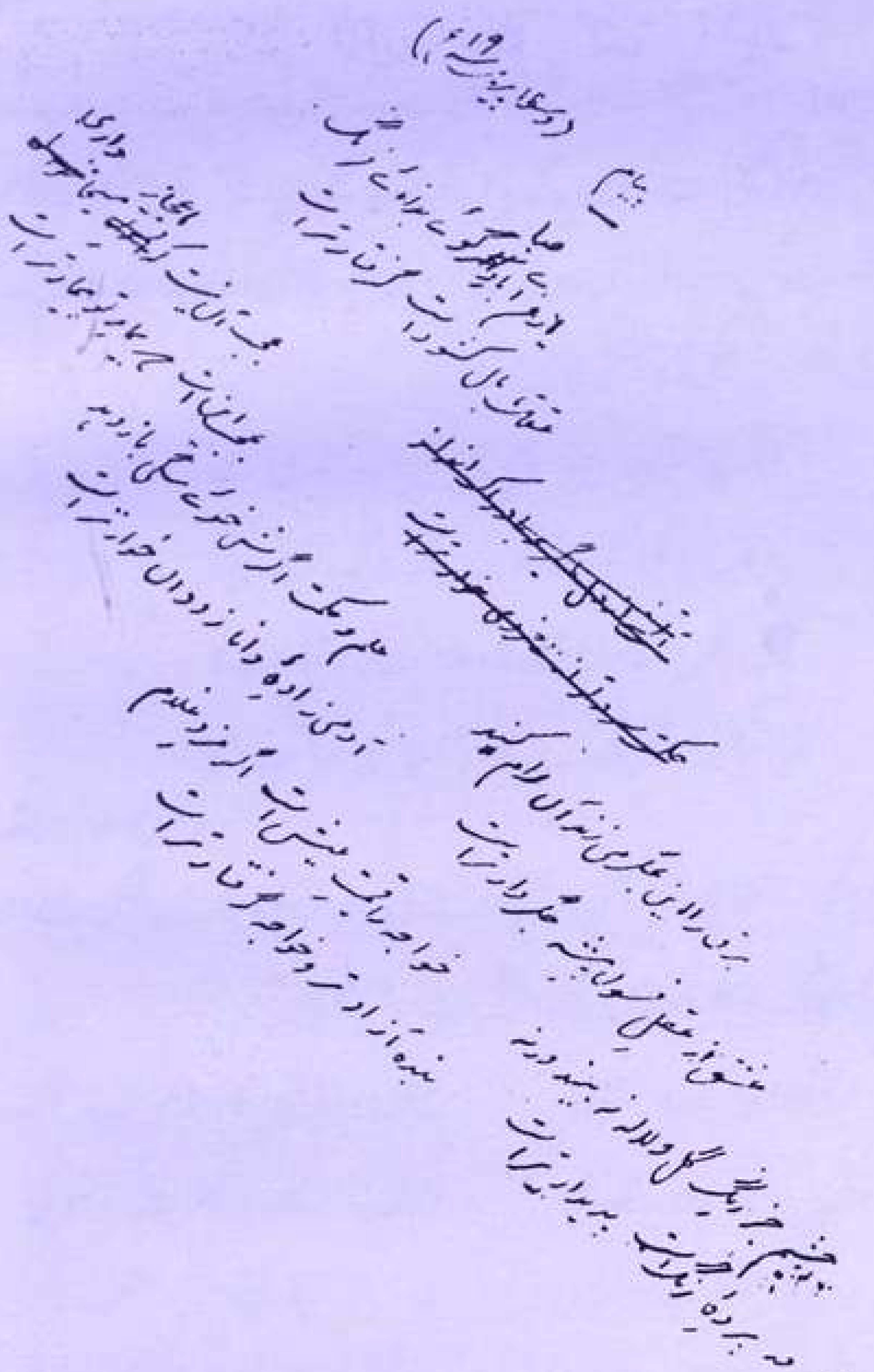

"پیامِ مشرق" (فارسی) میں ایک حصہ علامہ اقبال نے "نقشِ فرنگ" کے تحت سپردِ قلم کیا ہے۔
اس کی پہلی نظم "پیام" اقبال کے اپنے قلم سے۔

اقبالؔ اور جوشؔ کی شاعری میں انقلابی رجحانات!

(آزادیٔ ہند کے تناظر میں)

تحریکِ آزادیٔ ہند کے سورماؤں کی اگر ہم مختصر ترین فہرست تیار کرنا چاہیں اور وہ بھی ملک کے موجودہ سیاسی اور سماجی تناظر میں تو اس میں تین نام شامل ہونگے ۔ گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد۔ اگر مزید احتیاط کا مظاہرہ کیا جائے اور اس میں مزید ایک کردار کا اضافہ مقصود ہو تو وہ ہوگا :

"انقلاب زندہ باد!" کا نعرہ

بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس عظیم اصطلاح کو مزدور یونین بازوں نے کثرتِ استعمال سے سستے معنی پہنا دیے۔ اب "انقلاب" کے معنی، غصہ، نفرت، خونریزی، بم کلچر، بھوک ہڑتال، یورش، بغاوت، جنگ بازی، بدلہ خوری اور لوٹ مار کے، لیے جانے لگے ہیں۔ جب کارسیوک بابری مسجد کی شہادت کے لیے ایودھیا کی طرف مارچ کرنے لگے تو اُن کی زبانوں پر "جے سیارام" کے علاوہ "انقلاب زندہ باد" کا بھی نعرہ تھا، جس کا تجربہ خود راقم نے ۴ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو یعنی بابری مسجد کی شہادت سے چند گھنٹے پہلے لکھنؤ میں، ان کے قریبی مشاہدے سے کیا ہے۔ اس کے برعکس شہید بھگت سنگھ، اشفاق اللہ خان اور بی کے دتّ کی نظروں میں انقلاب کا تصور کیا تھا، اس کا ہلکا سا جائزہ آصف علی کی زبانی سنیے جو انھوں نے

۶؍جون ۱۹۲۹ء کو بھگت سنگھ اور بی کے ڈت کی جانب سے عدالت میں ان کے زیرِ سماعت مقدمے کے دوران پڑھ کر سنایا تھا۔ وہ کہتے ہیں :

''انقلاب، قطعی ضروری نہیں کہ خونریزی کا پیش خیمہ ہو۔ نہ ہی اس میں کسی ذاتی چپقلش اور خاندانی عداوتوں کا حساب چکتا کرنے کی گنجائش ہے۔ وہ بموں اور پستولوں میں عقیدہ رکھنے کا نام بھی نہیں ہے۔ ''انقلاب'' سے ہم یہ معنیٰ مراد لیتے ہیں کہ موجودہ نظام جس کی اساس ناانصافی پر قائم ہے، بہرصورت بدلنا چاہیے۔''

وہ آگے رقمطراز ہیں:

''انقلاب عالمِ انسانیت کا ایسا حق ہے جسے انسانیت سے کسی صورت میں جدا نہیں کیا جاسکتا۔ آزادی سبھی لوگوں کا ایسا پیدائشی حق ہے جس کا خاتمہ ممکن نہیں............انقلاب کی قربان گاہ پر ہم اپنی جوانیوں کی قربانی پیش کرنے آئے ہیں۔ کیوں کہ کسی بھی قسم کی قربانی اس عظیم نصب العین کے سامنے کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ہم مطمئن ہیں اور ہمیں انقلاب کی آمد کا انتظار ہے۔''

[ماخوذ: اردو دنیا، اگست ۲۰۰۱ء]

آسمانِ دنیا نے فتحِ مکہ کا انقلاب بھی دیکھا اور انقلابِ فرانس کو بھی ملاحظہ کیا۔ خونِ انسانی کی قدر اور اس کی ارزانی کی دونوں داستانیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ فتحِ مکہ، عالمِ انسانیت کا وہ پہلا سیاسی انقلاب ہے جس میں خون کا ایک قطرہ بھی بہایا نہیں گیا لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہوسکا جب سماج کی تربیت نبی آخرالزماںؐ نے مسلسل ۲۱ ؍برسوں کی شبانہ روز محنت کے بعد کی تھی۔ آسمانی ہدایت کے ساتھ جب منصبِ نبوت کی حلاوت شامل ہوجاتی ہے تو زندگی کا ایک ایک لمحہ منقلب ہوجاتا ہے جس کے لیے اقبالؔ نے کہا ہے کہ:

جس میں نہ ہو انقلاب مَوت ہے وہ زندگی
روحِ اُمم کی حیات، کشمکشِ انقلاب!

(مسجدِ قرطبہ)

آزادی کی تحریک یقیناً ایک سیاسی انقلاب کے حصول کے لیے جدوجہد تھی، جس کے لیے گاندھی جی نے ستّیہ گرہ اور اہنسا کا راستہ چنا۔ آزادی کے متوالوں کے لیے انقلاب کے حصول کے لیے دونوں تجربے اپنے آپ میں ایک نہایت غیر آزمودہ نسخے تھے، لیکن گاندھی جی نے خود کئی مرتبہ نہایت فخر سے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ دونوں فارمولے انھوں نے اسلامی تعلیمات سے اخذ کیے ہیں۔

جب آزادی کی تحریک چلی تو ہندوستان میں مسلمانی حکومت کو لٹے پٹے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مغلیہ سلطنت کے ملبے پر آزادی کا عَلَم اس ملک میں سب سے پہلے مسلمانوں نے ہی چڑھایا تھا۔ اسی کے نتیجے میں شعوری یا غیر شعوری طور پر آزادی کی تحریک پر، اردو، مسلمان، اسلامی روایات، مروّت اور اُن کی مشہورِ زمانہ وفاداری اور وفاشعاری آخر دم تک ابرِ رحمت کی طرح چھائی رہی۔ ٹیپو سلطانؒ، سید احمد شہیدؒ اور بہادر شاہ ظفرؔ کے کفن ابھی میلے بھی نہیں ہوئے تھے جب جانبازوں نے انقلاب زندہ باد کا نعرہ گنگ و جمن کے میدانوں سے لے کر کنیا کماری کے پانیوں تک پہنچا دیا تھا۔

یہی وہ انقلاب آور دَور تھا جس کے عین عالمِ شباب میں ڈاکٹر علامہ اقبالؔ اور جوشؔ ملیح آبادی نے آنکھیں کھولیں۔ علامہ اقبالؔ کا سنِ ولادت ۹/نومبر ۱۸۷۷ء ہے اور سنِ وفات ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء ہے۔ جوشؔ ملیح آبادی ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے اور ۲۲/فروری ۱۹۸۲ء کو رحلت فرما گئے۔ اقبالؔ نے تقریباً ۶۱/سال کی عمر پائی اور جوش نے تقریباً ۸۶/سال۔ ہجری سن کے حساب سے ان کی عمروں میں بالترتیب ۲/اور ۳/برسوں کا مزید اضافہ کرنا پڑے گا۔ اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں شعراء نے تحریکِ آزادی کو رسوئی

سے لے کر ڈرائنگ روم تک دیکھا تھا۔

یہ الگ بحث ہے کہ اِن دونوں شعراء نے تحریکِ آزادی کو کتنا فکری چندہ دیا اور حالات کی سیماب صفتی سے کیا کچھ حاصل کیا، لیکن اتنا ضرور ہے کہ اِن دونوں کی شاعری نے لفظِ ''انقلاب'' کو لازوال اور آفاقی بنادیا۔

جوشؔ کے پاس انقلاب کا تصور کیا تھا؟ اس سلسلے میں ہم چاہتے ہیں کہ اس کا جواب آپ سیّد محمد عقیل رضوی سے سنتے چلیں :

''جو لوگ جوشؔ سے ایسا سوال کرتے ہیں، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جوشؔ ایک شاعر اور فنکار تھے۔ وہ کوئی سیاسی مفکّر اور رہنما نہ تھے کہ انقلاب کا کوئی ایسا باضابطہ نظام پیش کر سکتے جیسا کہ دنیا کے انقلابیوں نے یا انقلابی مفکرین مثلاً مارکس، اینگلز، ماؤ، لینن اور ہندوستان میں ایم این رائے، گاندھی جی اور سبھاش چندر بوس نے پیش کیا۔ جوشؔ کو چینی انقلابی سن یات سین یا ہوچی منھ کے تصوّراتی پیمانے سے بھی ناپنا مناسب نہیں۔ ایک شاعر کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے انقلابی شعراء سے ہی جوشؔ کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں، جہاں گوپال کرشن گوکھلے، تلک، مسز اینی بسنت اور گاندھی جی، ملک کے بدلتے ہوئے حالات کے تحت، سیاست کا رُخ بدلتے تھے، وہاں کسی منظم انقلاب کا اگر کوئی تصور کسی کے پاس تھا تو صرف اس قدر کہ ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانا ہے۔ اس کا طریقِ کار کیا ہوگا، یہ بہت کچھ اُس وقت کے حالات پر منحصر ہوتا تھا۔۔۔۔۔۔!''

[جوشؔ ملیح آبادی : خصوصی مطالعہ۔ صفحہ ۴۹]

حالات اور جوشؔ کی فکری اساس کے تناظر میں اگر ہم اُن کے کلام کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے بھی متضاد سمتوں میں اپنے توسنِ فکر کو مہمیز دی ہے۔ عوام نے انھیں شاعرِ انقلاب، شاعرِ تغیر، شاعرِ رومان، شاعرِ لفظ و آہنگ، شاعرِ جوش و خروش اور شاعرِ فردا کا نقیب کہا ہے۔ سکّہ بند مذہبی افراد نے انھیں بے راہ رو، امرد پرست، حُسن پرست، رند بلانوش اور پتہ نہیں کیا کیا کہہ ڈالا۔ نثر میں 'یادوں کی بارات' کے علاوہ اُن کے ایک درجن سے زیادہ مجموعہ ہائے کلام شائع ہوئے۔ ذرا اِن مجموعوں کے نام ملاحظہ فرمائیں: روحِ ادب، عرش و فرش، جنون و حکمت، سیف و سُبو، رامشِ و رنگ، فکر و نشاط، شعلہ و شبنم، سرود و خروش، سموم و صبا، طلوعِ وافکار، نجوم و جواہر، حرف و حکایت، الہام وافکار، وغیرہ۔ اِن میں سے اکثر نام متضاد معنویت لیے ہوئے ہیں اور تراکیبِ عطفی واضافی سے مملوھیں۔ وہ متضاد رنگوں، متضاد خیالوں اور متضاد کیفیتوں سے نئے معنی تلاشنے اور تراشنے کے عادی ہیں۔ یہ دراصل اس لیے ہے کہ انقلاب و تغیرّ کی اُجلی کرن جب اُن کے فہم و ادراک کے منشور مثلثی Prism سے گذرتی ہے تو بامعنی شعور کا ایک دھنک رنگ طیف (Spectrum) بنا لیتی ہے۔ اُن کے لفظ لفظ سے انقلاب کی روح دھڑکتی ہے اور وہ کہہ اٹھتے ہیں کہ ؎

خواب کو جذبۂ بیدار دیے دیتا ہوں
قوم کے ہاتھ میں تلوار دیے دیتا ہوں

....

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

....

''شعلہ و شبنم'' کی نظم ''پیمانِ محکم'' کے یہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں :

قسم اُن غازیوں کی موت سے جو جنگ کرتے ہیں
اُپی تلوار کی بڑش سے جن کے زخم بھرتے ہیں
قسم ان کی جو ہنس کر خون میں اپنے نہاتے ہیں
خوشی سے رن میں ڈٹ کر منہ پر تلواریں جو کھاتے ہیں
قسم اُن گھن گرج پُر ہَول توپوں کے دہانوں کی
گرج سے جن کے ہل جاتی ہیں بنیادیں چٹانوں کی
قسم اُس سانس کی، جو موت کے ہنگام چلتی ہے
قسم اُس وقت کی، جب زندگی کروٹ بدلتی ہے
قسم اُس ضرب کی، توڑا تھا جس نے بابِ خیبر کو
قسم اُس شیر کی، جس نے چبا ڈالا تھا عَنتر کو
قسم اُس تیر کی، چلتا تھا جو چٹکی سے اَرجن کی
قسم میدان میں گاتی ہوئی، تلوار کی دُھن کی
قسم اس جوشؔ کی جو ڈوبتی نبضیں ابھارے گا
کہ اے ہندوستاں، جیسے ہی تو مجھ کو پکارے گا
مری تیغِ رواں، باطل کے سر پر جگمگائے گی
ترے ہونٹوں کی جنبش ختم بھی ہونے نہ پائے گی

''شعلہ و شبنم'' جوشؔ کی تمام کتابوں میں سب سے جاندار کتاب ہے۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ غالباً یہ ''روحِ ادب'' کے بعد شائع ہونے والی سب سے پہلی کتاب ہے۔ روحِ ادب ۱۹۲۰ء میں چھپی۔ ترکِ جمود، نعرۂ شباب، آثارِ انقلاب،

صدائے بیداری، ملکوں کا رجز، بیدار ہو بیدار، بغاوت، زندان کا گیت، ناخدا کہاں ہے؟، حیف! اے ہندوستاں، مردِ انقلاب کی آواز، آنسو اور تلوار وغیرہ وغیرہ، یہ اُس زمانے کی نظمیں ہیں جب ہمارے مجاہدینِ آزادی کی کوششیں اپنے شباب پر تھیں۔ وہ جنگِ آزادی کا رجز پڑھتے ہوئے نہ تھکتے تھے۔ جوشؔ نے ''ملکوں کا رجز'' نامی ایک نظم میں انگلستان، امریکہ، فرانس، جرمنی، روس، جاپان، ترکی، ایران اور افغانستان کی زبانی اُن کی اپنی تاریخ اور اُن میں بسنے والی قوموں کی تعریف بیان کی ہے، لیکن جب سب سے آخر میں ہندوستان کی باری آتی ہے تو دیکھیے وہ کیا کہتا ہے :

نہنگوں کا سمندر ہوں، درندوں کا بیاباں ہوں!
عدو سے کیا غرض اپنوں سے ہی دست و گریباں ہوں
خُدا کے فضل سے بدبخت ہوں، بُزدل ہوں، ناداں ہوں
مری گردن میں ہے طوقِ غلامی، پابجو لاں ہوں!
درِ آقا پہ سر ہے، کفش برداری پہ نازاں ہوں!

جوشؔ اپنے کلام میں زندگی کی حرکت و حرارت، پیکار اور پیہم کار کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے ہمیشہ انقلابی قوّتوں کے پاسباں اور امین سرشت الفاظ کی فوجیں لائے ہیں۔ ''ناخدا کہاں ہے؟'' کی لفظیات دیکھیے :

غضب کے گرداب پڑ رہے ہیں، عظیم طوفان زور پر ہے
بلا کی پُروائی چل رہی ہے، جلال میں روحِ بحر و بر ہے
تھپیڑے کھاتا ہوا سفینہ، کبھی اِدھر ہے کبھی اُدھر ہے
ہوا اٹھائے ہوئے ہے طوفاں، گھٹا اٹھائے ہوئے زباں ہے
کوئی خدا کے لیے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے، کہاں ہے؟

بھرا ہوا غیظ میں سمندر فضا کی جانب ہمک رہا ہے
گرج کڑک ہے، کڑک چمک ہے، چمک ہوا ہے، ہوا گھٹا ہے
جھنن جھنن ہے، گھڑ گھڑ ہے، گھنن گھنن ہے دنا دنا ہے
فلک کے ہونٹوں پہ الحذر ہے، زمین کے لب پہ الاماں ہے
کوئی خدا کے لیے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے، کہاں ہے؟

ہمارے پاس اس بات کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے کہ تحریکِ آزادی میں جوشؔ کی انقلابی شاعری نے آزادی کے متوالوں کو کتنا متاثر کیا۔ اور کتنے اُن کی شاعری پڑھ کر پھانسی کے پھندوں پر جھول گئے۔ جس طرح غدر کے بعد کے روتے اور بلکتے ہندوستان نے میر تقی میرؔ کی شاعری کو گلے سے لگایا ہے بالکل اسی طرح ہر فکری اور سیاسی انقلاب کے دوران جوشؔ کی ارضی سچائیاں، کوہ قامت پیمائیاں اور لاجوردی لفظیات کی پہنائیاں ہندوستانی عوام کی ظاہری و باطنی نفسیاتی امنگوں کی دستگیری کرتی رہیں گی۔ اُردو زبان والے لفظوں کے اس شہنشاہ پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے کیونکہ بھارت کی کسی دوسری زبان میں اس سطح کا ایک شاعر تو دور کی بات، اس سطح کی ایک نظم بھی موجود نہیں ہے۔

اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ جوشؔ کہ بہ نسبت اقبالؔ کی شاعری کو سمجھنا مشکل ہے۔ اگر کسی مثبت پیغام کا نام انقلاب ہے تو اقبالؔ کی پوری شاعری انقلاب ہے۔ اقبالؔ اپنے دور کے دنیا میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے انسان تھے، جنھوں نے اپنے قلم سے انسانی قافلوں کی فکری اور ذہنی قیادت کا فریضہ انجام دیا ہے۔ وہ فارسی، اردو، انگریزی، عربی، سنسکرت، ہندی اور پنجابی زبانیں جانتے تھے۔ انھوں نے عصری اور کلاسیکی علوم کا اس کی اوریجنل زبان میں مطالعہ کیا تھا۔ پشتو، سرائیکی اور کشمیری زبان بولنے والوں سے انھیں رات دن سابقہ پڑتا رہتا تھا کیونکہ وہ کشمیری پنڈتوں کی نسل سے تھے اور پنجاب میں رہتے تھے۔

یعنی بود و باش کے اعتبار سے وہ پنجابی تھے۔ اسلامی تاریخ، سیرتِ نبویؐ اور قرآنِ کریم کے گہرے مطالعے نے ان کی فکر میں ایک صلابت اور ان کی انقلابی فکر میں گہری معنویت پیدا کردی تھی۔ وہ یقیناً جوش سے بڑے شاعر تھے۔ بلکہ بیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ جوشؔ کی پختہ عمر شاعری میں لڑکپن اور اقبالؔ کی لڑکپن کی شاعری میں پختہ فکر کی شان پائی جاتی ہے۔

انقلاب کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک اضطراب و ہیجان جو وقتی ہوتا ہے دوسرا خاموش انقلاب جو اکبر الہ آبادی اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کی صحبت نے مولانا عبدالماجد دریادی میں پیدا کردیا تھا۔ یہ انقلاب عہد آفریں، دیرپا بلکہ مسلسل و مدام ہوتا ہے۔ جدوجہدِ آزادی میں دونوں انقلابات کی ضرورت تھی۔ اس کے بغیر آزادی حاصل نہیں کی جاسکتی تھی یا مضبوط فکری بنیادوں پر قوم کی تعمیر ممکن نہیں تھی۔ اقبالؔ کا فلسفۂ خودی، اس کا تصورِ مردِ مومن، اُن کا تصورِ موت و حیات، اُن کا تصورِ وطن، اُن کی جمالیاتی حِس، اُن کا فلسفۂ تعلیم، اُن کا تصورِ آزادی و محکومی، اُن کا تصورِ پیرِ رومی، اُن کا مریدِ ہندی، اُن کا تصورِ الٰہ و ابلیس، سب کے سب انقلابی خیالات ہیں جو سعی، کوشش، جہدِ مسلسل، پیکار اور پیہم کار کی علامت ہیں۔ یہ تصورات سرزمینِ ہند سے عین انگریزوں کی غلامی کے دور میں اردو اور فارسی میں پہلی اور آخری مرتبہ بلند ہوئے ہیں۔ اب عقل کام نہیں کرتی کہ اس سطح کے انقلاب آفریں تصورات دوبارہ اس دھرتی سے اٹھیں گے بھی یا نہیں؟

کوہ کن کی بات گئی کوہ کن کے ساتھ

سو سال ہونے کو آئے لیکن کسی زبان کا کوئی شاعر ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کی نظیر پیدا نہیں کرسکا ہے۔ ملّی اتحاد پیدا کرنے کے لیے وہ مندر اور مسجد دونوں سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں، جو تنازعے کی فکری اساس پیدا کرنے والے عوامل

ہیں اور کہتے ہیں کہ ؎

تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے
سونی پڑی ہوئی ہے مدّت سے دل کی بستی
آ، اِک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

(نیا شوالہ : بانگِ درا)

جاں سوزی و جاں گدازی، بے چینی و بے قراری، عقل کی غلامی، حق و باطل کی کشمکش میں ایک مردِ آزاد و خود آگاہ کا طمطراق اور انقلابی کیفیات اگر دیکھنا ہو تو اقبالؔ کی زبانی ''سلطان ٹیپو کی وصیّت'' سنیے :

تو رہ نوردِ شوق ہے، منزل نہ کر قبول!
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو، محمل نہ کر قبول!
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز!
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول!
صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیلؑ نے!
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول!
باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

(سلطان ٹیپو کی وصیت : ضربِ کلیم)

اقبالؔ کے کلام میں انقلاب، حرکت و عمل کا دوسرا نام ہے۔ حرکت و عمل کو پیدا کرنے کے لیے رزقِ حلال شرطِ اوّلین ہے۔ اس ضمن میں اقبالؔ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں ؎

اے طائرِ لاہوتی، اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو، پرواز میں کوتاہی

حرکت و عمل، سعئ پیہم، جسے اقبالؔ کی زبان میں پیکار اور پیہم کار بھی کہا جاسکتا ہے اگر صرف رزقِ حلال کے حصول کے لیے ہی محدود ہو تو اس سے بڑی ناکامی اُن کی نظر میں اور کوئی نہیں

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

....

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

جنگِ آزادی کے خوفناک ماحول میں اقبالؔ نے جو سب سے دلیرانہ فریضہ انجام دیا ہے انھوں نے اپنی فارسی اور اردو شاعری کے ذریعے مغرب، اقوامِ مغرب، ان کی شاطرانہ چالوں اوران کی سیاسی بازیگری کی نفی کی ہے۔ یہ اپنے آپ میں خود ایک بہت بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔ جب کہ انگریز افسر کے سامنے کھلی سڑک پر سے گذرنے میں اچھے اچھوں کا کلیجہ منہ کو آتا تھا، ایسے دور میں انگریزوں کو معصومانِ یورپ، شیشہ گر، نئی تہذیب کے گندے انڈے کہنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔

اقبالؔ کی تیسری اردو کتاب ''ضربِ کلیم'' میں مثنوی کے انداز پر لکھی ہوئی ایک طویل مختصر نظم ملتی ہے ''شعاعِ امید''۔ یہ پختہ کار اقبالؔ کی ۱۹۲۸ء کے بعد کی لکھی ہوئی

نظم ہے جسے اقبالؔ نے تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں سورج اپنی کرنوں سے تیرگی ایّام کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ لگاتار چمکنے کے باوجود بھی میں زمانے میں روشنی نہ پھیلا سکا۔ اس لیے انھیں حکم دیتا ہے کہ :

پھر میرے تجلّی کدۂ دل میں سماجاؤ
چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

دوسرے حصّے میں ایسا منظر ہے کہ دنیا کے کونے کونے سے شعاعیں اٹھتی ہیں۔ وہ مشرق اور مغرب سے گریہ کناں اور بیزار ہیں۔ اور سورج سے کہتی ہیں کہ :

پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپالے
اے مہرِ جہاں تاب نہ کر ہم کو فراموش!

اس نظم کا تیسرا حصہ انتہائی جاندار ہے۔ اس حصّے میں اقبالؔ کی حب الوطنی، مشرق سے پُر امیدی، آرزوئے انقلاب اور انقلاب کے لیے پُر امید رہنے کی زبردست خواہش صاف جھلکتی ہے :

اِک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہِ حُور　آرام سے فارغ، صفتِ جوہرِ سیماب!
بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو　جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرّہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو　جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب!
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز　اقبالؔ کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب!
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن　یہ خاک ہے جس کا خزف ریزہ ہے دُرِ ناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غوّاصِ معانی　جن کے لیے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب!
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں　محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن　تقدیر کو روتا ہے مسلماں تۂ محراب!

مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے ہر شب کو سَحر کر!

اقبال کی نظر میں انقلاب کوئی موسمی پھل نہیں یا تحریکِ آزادی میں چلنے والی ''ڈگمگاتی، جھومتی، سیٹی بجاتی، کھیلتی'' ہوئی کوئی ریل نہیں کہ جہاں ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کا اسٹیشن آیا اور آپ اتر کر چلتے بنے اور پھر پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ ''انقلاب زندہ باد'' باقی رہا بھی یا نہیں۔ زندگی میں انقلاب لانا معمول کی بات ہے۔ لیکن اقبال کی فکرِ رسا اور انقلابی رجحانات نے موت کے وقت انقلاب لانے کی بجائے موت کو انقلابی بنا دیا۔ ''ساقی نامہ'' جیسی معروف نظم میں زندگی اور موت کی یہ کشمکش دیکھیے:

ہوا جب اُسے سامنا موت کا — کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا!
اُتر کر جہانِ مکافات میں — رہی زندگی موت کی گھات میں
مذاقِ دوئی سے بنی زَوج زَوج — اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے! — اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے!
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات — ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات
بڑی تیز جولاں، بڑی زود رس! — ازل سے ابد تک رمِ یک نفس!

(ساقی نامہ : بالِ جبریلؒ)

مَوت کی آغوش میں زندگی کے آثار دیکھنا کوئی معمولی بات نہیں لیکن فکرِ اقبال کے لیے یہ معمول کی باتیں ہیں۔ ''گورستانِ شاہی'' کی زیارت کے وقت اقبال کا یہ پیغام سنیے:

باغ میں خاموش جلسے گلستاں زادوں کے ہیں — وادیٔ کہسار میں نعرے شباں زادوں کے ہیں
زندگی سے یہ پُرانا خاکداں معمور ہے — موت میں بھی زندگانی کی تڑپ مستور ہے
پتیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح — دستِ طفلِ خفتہ سے رنگیں کھلونے جس طرح

(گورستانِ شاہی: بانگِ درا)

اور پھر یہ اشعار سنیے جن میں وہ ایک پیشہ ور واعظ کی طرح عذابِ قبر سے ڈرانے کی بجائے زندگی کا راگ سُنا رہے ہیں :

ہیں ابھی صد ہا گہر اِس ابر کی آغوش میں　　برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں
وادیٔ گل، خاکِ صحرا کو بنا سکتا ہے یہ　　خواب سے امیدِ دہقاں کو جگا سکتا ہے یہ
ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

(گورستانِ شاہی: بانگِ درا)

کیونکہ ''روحِ ارضی آدم کے استقبال'' کے وقت اس سے یہ کہہ چکی ہے کہ :

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اِک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوشش پیہم کی جزا دیکھ!

اقبالؔ نے تحریکِ آزادی میں عملی حصّہ لیا تھا۔ جیل جانے کے علاوہ انھوں نے آزادیٔ کا ہر کام کیا تھا۔ کونسل کی ممبری سے لے کر تو گول میز کانفرنسوں تک، راتوں کو جاگ جاگ کر نظمیں کہنے اور سنانے سے لے کر تو آزادی کے رہنماؤں کے کان مروڑنے تک ایک گائیڈ، فلاسفر اور فرینڈ کی حیثیت سے انھوں نے اپنا انقلابی کردار ادا کیا تھا۔ خلافت تحریک کے عین عروج کے زمانے میں کس کی یہ مجال تھی کہ مندرجہ ذیل اشعار کہہ سکے :

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے　　تو احکامِ حق سے نہ کر بیوفائی!
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟　　خلافت کی کرنے لگا تو گدائی!

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی!

(دریوزۂ خلافت: بانگِ درا)

یا ''خضرِ راہ'' کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں :

موسیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست مورِ بے پر! حاجتے پیشِ سلیمانے مبر

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر!

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی اڑگیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر

تاخلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار لاکہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب وجگر

(خضرِ راہ : بانگِ درا)

اقبال نے اپنی انقلاب صفت طبیعت کی آبیاری کے لیے فلسفہ وفکر کی عظیم گھاٹیاں طے کی ہیں۔ جہاں انھیں عشق، حرکت، سوز وگداز، نالۂ نیم شبی، بے قراری و بے تابی، آزادی وکامرانی اور زندگی وحرارت کی نرم دؤب اور گھنی چھاؤں دکھائی دیتی ہے تھوڑی دیر کے لیے ہی کیوں نہ سہی ستاتے ضرور ہیں۔ انیسی شاملو، افلاطون، مجدّد الف ثانی، ہٹلر، مسولینی، کارل مارکس، فریڈرک اینگلز، سوامی رام تیرتھ، نانک، رام، نپولین، حکیم نطشہ، گوئٹے، بھرتری ہری، مصطفی کمال پاشا، حضرت جنید بسطامیؒ، سلطانِ ہند خواجہ چشتیؒ، سپنوزا یہاں تک کہ ابلیس بھی اقبال کی انقلابی فکر کو مہمیز دینے کے صلے میں اُن سے خراجِ عقیدت وصول کرتا ہے۔

صرف اسی پر بس نہیں، بلکہ انھوں نے اپنے انقلاب آفریں خیالات کو متعدّی بنانے کے لیے موٹر، جگنو، ستارہ، گائے، بکری، گلہری، شمع، پروانہ، پرندہ اور ماہِ نو تک سے اپنے تصوّرات کی ترسیل کا کام لیا ہے۔ موضوعات کے تنوّع کے اعتبار سے بھی اقبال کا کلام اردو ادب اور آزادیٔ ہند کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب تک کی تحریروں

میں ''آزادی کی تحریک میں اقبال کی شرکت'' کو ثابت کرنے کے لیے اقبالؔ کے مداحوں نے ''بندگی میں گھُٹ کے رہ جاتی ہے اِک جوئے کم آب۔ اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی''، جیسی نظمیں پیش کی ہیں۔ ہمالہ، نیا شوالہ، ہندوستانی بچّوں کا قومی گیت؛ یعنی میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے؛ ترانہ ہندی یعنی 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا، یقیناً تحریکِ آزادی کی تاریخ میں تاریخ ساز لمحات کو جنم دینے والی نظمیں ہیں۔ لیکن ہمارا ماننا ہے کہ آج دنیا میں جو زبردست سائنسی، ثقافتی، علمی، تہذیبی، معاشی، معاشرتی اور تعلیمی انقلاب آیا ہوا ہے اس کے ڈانڈے آج سے چودہ سو سال پہلے واقع شدہ دو عظیم الشان واقعات سے ملتے ہیں۔ ایک ہے معراجِ نبویؐ اور دوسرا ہے ہجرتِ نبویؐ۔ معراج نبویؐ نے فکرِ انسانی کے ساتھ ساتھ جسمِ انسانی کو بھی سُرعت بخشی۔ اسی کے مطالعے کے بعد البرٹ آئنسٹائن نے نظریۂ اضافی (Law of Relativity ; $E=mc^2$) تعمیر کیا۔ سُرعت اور اسراع کے پیمانے اسی واقعے کے بعد تشکیل دیے گئے۔ اسی واقعے نے مادّی پوجا پاٹ کے وسائل یعنی زمین، آسمان، سورج، چاند، پہاڑ، دریا، ستارہ، بارش اور مافوق الفطرت جیسی اشیاء کو بجائے پوجا پاٹ کے؛ تحقیق کا سادھن (Object for Research) بنادیا اور دیکھتے ہی دیکھتے انسان نے وہ رفتار حاصل کرلی جو اُس نے اِس کرۂ ارض پر کروڑوں سال سے رہنے بسنے کے باوجود حاصل نہیں کی تھی۔

بالکل اِسی طرح واقعۂ ہجرت نے انسانی تمنّا کو پر لگادیے اور وہ دنیا کے دوسرے خطوں میں جاکر مستقل بود و باش اختیار کرنے کے متعلق سوچنے لگا اور عالمی سیاست نے ایک زبردست پلٹا کھایا اور ساری دُنیا ایک چھوٹا سا گاؤں بن گئی اور آندھرا کے جنگلوں میں لگایا جانے والا قہقہہ امریکہ کے وھائٹ ہاؤس میں سنا جانے لگا۔ فاصلوں کو طے کرنے کے لیے بیل گاڑی کے پہیوں میں برق و بخارات کی پیوندکاری کی گئی۔ پھر ان پہیوں نے پنکھوں کا روپ اختیار کرلیا۔ جب ان پنکھوں نے ہوا کو کاٹنے میں ست رفتاری دکھائی تو اُن کو الٹا کر

کے ہوائی جہاز کے پیٹ اور پیٹھ میں جڑ دیا گیا اور وہ جیٹ کہلائے۔ جیٹ کے زمزموں نے جب فضائی کرّے کو چھوڑ کر خلاء میں جانے سے انکار کر دیا تو انھیں ایک دھماکے کے ساتھ داغ کر الگ کر دیا گیا اور یہ راکٹ کہلایا:

پَرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

یا پھر :

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریّت کی زد میں ہے گردوں

....

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ایسی نظمیں اقبال سے ذرا نچلی سطح کا ایک عام انقلابی شاعر بھی کہہ سکتا تھا۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنی گفتگو کا اختتام ایک ایسی نظم پر کریں جو مختصر بھی ہو، جامع بھی ہو اور جس میں معراج کی سیکولر قدروں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے انقلابی پیغام بھی ہو اور پیغامِ انقلاب بھی ہو اور ایسا انقلاب جو قیامت تک ملتوں کی رہنمائی کر سکے :

دے ولولۂ شوق اگر لذّتِ پرواز ۔۔۔ کر سکتا ہے وہ ذرّہ مہ و مہر کو تاراج!
مشکل نہیں یارانِ چمن! معرکۂ باز ۔۔۔ پُر سوز اگر ہو نفسِ سینۂ دُرّاج!
ناوک ہے مسلماں! ہدف اس کا ہے ثریّا ۔۔۔ ہے سرِّ سرا پردۂ جاں نکتۂ معراج!

تو معنیٔ والنّجم نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مدو جزر ابھی چاند کا محتاج!

(معراج : ضربِ کلیم)

□□□

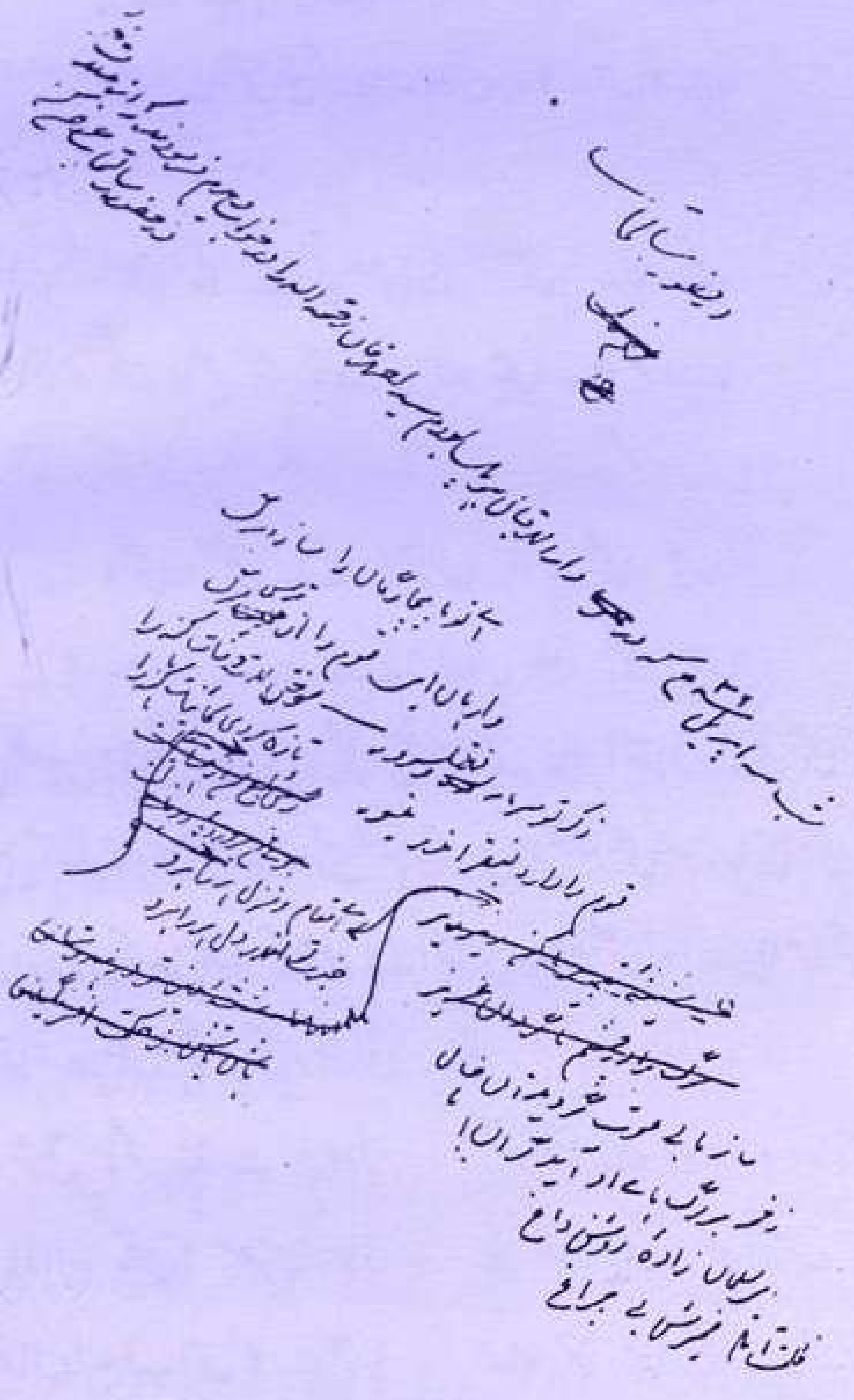

”ارمغانِ حجاز“ فارسی اور اردو زبان میں ہے۔ پہلی بار دونوں حصے ایک ساتھ چھپے تھے۔ بعد میں فارسی حصہ الگ کر دیا گیا۔ اسی کتاب کی مشہور نظم ’در حضورِ رسالتمآب‘ کا ایک جزء اقبال کے قلم سے۔

اقبالؔ کا جادو

۱۹۹۵ء کی بات ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف نیشنل انٹی گریشن (INI) میں فیکلٹی ڈِولپ منٹ کی نشستوں کے لیے مجھے بلایا گیا تھا۔ موضوعات متنوع تھے، اس لیے کئی دنوں تک مجھے وہاں کے اساتذہ کی تربیت کے لیے حاضری دینی پڑی۔ انسٹی ٹیوٹ آف نیشنل انٹی گریشن، بھارتی دفاعی افواج کا ایک نہایت ہی وقیع اور معزز ادارہ ہے، جہاں فوج کے اعلیٰ افسروں کو قومی یکجہتی، اقدار و اخلاقیات اور بین المذہبی معلومات سے متعلق تربیت دی جاتی ہے۔ دیگر عصری تحریکوں اور فکری انقلابات کے علاوہ انھیں ہندومت، عیسائیت، اسلام اور سکھ مذہب کا بھی مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔ اس ادارے میں افواج میں کام کرنے والے پنڈتوں، پادریوں، گرنتھیوں اور مولویوں کی بھی تربیت کی جاتی ہے جو یہاں سے فارغ ہونے کے بعد اپنی اپنی یونٹوں میں مذہبی ذمہ داریاں سنبھالتے ہیں اور افواج کی مذہبی ضروریات کو بھی پورا کرتے ہیں۔ یہاں منعقد کیے جانے والے کورسوں کی میعاد، ضرورت اور رینک (Rank) کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ اعلیٰ افسران کے لیے دو ہفتے اور تازہ واردان (Recruits) کے لیے چھ ہفتوں تک کا کورس ہوتا ہے۔ ایک کورس ایسا بھی ہوتا ہے جس میں آرمی، نیوی اور ایئر فورس کے افسران بھی شریک ہوتے ہیں۔

یہاں کام کرنے والے اساتذہ کو بہت زیادہ مستعد اور محتاط رہنا پڑتا ہے۔ تازہ ترین معلومات اور مذاہب کے جدید ترین رُجحانات سے انھیں ہمہ وقت واقف رہنا ہوتا ہے۔ اس لیے خود ان اساتذہ کی تربیت کا نظم بھی سال کے ایک مخصوص حصے میں کیا جاتا ہے۔

اس کے لیے بھی راقم الحروف کو مدعو کیا جاتا ہے اور اس بات کی پوری کوشش کی جاتی ہے کہ زیرِ تربیت اساتذہ جو کہ خود افواج کے اعلیٰ افسران ہوتے ہیں کھل کر بات کریں اور اپنی معلومات کو اَپ ٹو ڈیٹ کرلیں۔

اسی طرح کی ایک تربیت کے دوران کہیں اقبالؔ کا ذکر آگیا۔ میں نے یوں ہی دریافت کرلیا کہ بھارتی افواج بینڈ پر ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' اتنا بہترین بجاتی ہیں، کیا کبھی آپ نے اقبالؔ کو پڑھا بھی ہے؟ بس پھر کیا تھا، سوالات کی بوچھار ہوگئی۔ اقبالؔ کون تھے؟ وہ پاکستان کیوں چلے گئے؟ پاکستان نے انھیں اپنا قومی شاعر کیوں تسلیم کرلیا؟ پاکستانی ہوتے ہوئے بھی انھوں نے ''سارے جہاں سے اچھا کیوں لکھا؟'' وغیرہ وغیرہ۔ سوالات کی نوعیت سے آپ اِس بات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عدمِ واقفیت، غلط فہمیوں اور کمیونی کیشن کا کتنا بڑا Gap ہے جو اس ملک میں مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان حائل ہے اور ایسے کون کون سے کام ہیں جو اُردو والے کر ہی نہیں رہے ہیں۔

اقبالؔ کی عالمی پہچان کے لیے بتایئے اُردو والوں نے اب تک کیا کیا؟ ہندی، مراٹھی، کنڑ، ملیالم، تامل اور دیگر علاقائی زبانوں میں کلامِ اقبالؔ کے ترجمے، فلسفۂ اقبالؔ پر چھوٹی بڑی عام فہم کتابیں، اقبالؔ کی شاعری کے آڈیو، ویڈیو کیسیٹ اور سی ڈیز، اقبالؔ کے منتخب کلام کو دیوناگری رسم الخط میں تبدیل کرکے اُس کے مشکل الفاظ کی اُسی صفحے پر تشریح وغیرہ ایسے کام ہیں جو اُردو والوں کو بہت پہلے کرلینے چاہیے تھے۔

لوگ کہیں گے کہ اقبالؔ کا کلام مشکل ہے، تلمیحات سے مملو ہے، اس میں فارسی اور عربی اصطلاحات کی بھرمار ہے، فلسفہ جانے بغیر کلامِ اقبالؔ کا مطالعہ آسان نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس کے جواب میں ہم صرف اتنا کہنا چاہیں گے کہ غالبؔ کا کلام، اقبالؔ کے کلام سے زیادہ اَدق ہے۔ اس میں فلسفے کی کوئی متعین راہ اور اصولی بحث نہیں ہے جس کی ڈور پکڑ کر ہم

غالبؔ کے فن، تلمیحات، اصطلاحات، لفظیات اور فکر کو سمجھ سکیں اور زندگی گزارنے کے کسی لائحۂ عمل کو ترتیب دے سکیں۔ لیکن ان تمام گتھیوں کے باوجود بازار میں ہندی اور انگریزی کی لاتعداد کتب، دیوان اور شرحیں موجود ہیں جو غالبؔ کو گلی قاسم جان سے نکال کر پارلمنٹ اسٹریٹ اور کوپرنیکس مارگ تک پہنچاتی ہیں۔ غالبؔ کی زبان کو نہ سمجھتے ہوئے بھی اس کی غزلیں گانے والوں اور والیوں کا کوئی شمار نہیں۔ اُس کی مثنوی ''چراغِ دیر'' پر ملک کی مشہور رقاصہ شوونا نارائن نے تقریباً ایک گھنٹے کا بیلے فیچر تیار کیا ہے، جس کی ادبی اور معنوی ہدایت کاری علی سردار جعفری نے کی تھی اور جسے جدید ترین آلات اور فلمی نظری (Visuals) پس منظر میں اسٹیج پر پیش کرنے کا نظم ہے۔۔۔ حیرت اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس سطح کی ایک بھی کوشش اُردو والوں نے اقبالؔ کے ساتھ روا نہیں رکھی۔ حالانکہ کلامِ اقبالؔ میں ایسی درجنوں نظمیں ہیں جو ڈرامائی اور محاکاتی انداز میں کتابوں کے علاوہ دیگر ذرائع سے بھی اقبالؔ کو بھارت میں عام کرنے کے لیے پیش کی جاسکتی ہیں۔ اب اُردو چینل والے یہ فریضہ انجام دیں تو یقیناً انھیں بہت کامیابی ملے گی، کیونکہ یہ میدان اب تک خالی ہے۔

ہم بات کر رہے تھے آئی این آئی کی۔ جب مجھ پر سوالات کی بوچھار مکمل ہو چکی تو راقم نے نہایت مختصر الفاظ میں اقبالؔ کا تعارف کروایا اور یہ بات بتائی کہ پاکستان بننے سے پہلے اقبالؔ کا وصال ہو چکا تھا۔ اِس کے مابعد کلامِ اقبالؔ میں سے چند اشعار سنائے۔۔۔ جو اس وقت زبانی یاد تھے اُن میں بطورِ خاص ''نیا شوالہ''، جس میں اقبالؔ نے کہا ہے کہ

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو بُرا نہ مانے　　تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا　　جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا　　واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

جب اسی طرح پوری روانی کے ساتھ پڑھتے ہوئے نظم کے اختتام کو پہنچے کہ :

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھادیں — بچھڑوں کو پھر ملادیں، نقشِ دوئی مٹادیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدّت سے دل کی بستی — آ، اِک نیا شوالہ اس دیس میں بنادیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ — دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملادیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے — سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلادیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مُکتی پریت میں ہے

تو گویا کلاس روم میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ سیاست دانوں کی نعرہ بازیوں کے جواب میں Men in Uniform یعنی میدانِ جنگ میں توپ و تفنگ سے جھوجھنے والوں نے سارے پجاریوں کو پریت اور پریم کی شراب پلانے والی بات اس سے پہلے کب سنی تھی؟ وہ جھوم جھوم اٹھے۔ وقت ختم ہونے کے باوجود اس وعدے پر پیچھا چھڑایا کہ اگلا سیشن صرف اقبال کا ہوگا۔

بات صرف کلاس روم تک محدود نہیں رہی۔ ادارے کے ڈائریکٹر جو کہ بریگیڈیر ہوتے ہیں، خود بہ نفسِ نفیس کلاس میں موجود ہوتے ہیں اور انھوں نے بھی نہایت بلند الفاظ میں اپنے مثبت تائثر کا اظہار کیا۔ اس کارِ خیر کا تذکرہ دہلی اور شملہ تک پہنچا۔ شملہ میں ملک بھر کے تربیتی مراکز کے سربراہ لفٹنٹ جنرل کا صدر دفتر ہے۔ انھوں نے بھی اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور اس سلسلے کو جاری رکھنے کی ہدایات دیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اقبال کا تذکرہ وردی پوش افراد (Men in Uniform) کی نجی مجلسوں میں ہونے لگا۔ فرمائشیں ہونے لگیں کہ کلامِ اقبال سے چند آسان نظموں کا انتخاب کرکے اور انھیں ناگری رسم الخط میں تبدیل کرکے اور مشکل الفاظ کے معانی لکھ کر ایک چھوٹا سا کورس مرتب کر دیا جائے۔ چنانچہ اقبال کے اردو کلام

میں سے ترانۂ ہندی، ہمالہ، ہندوستانی بچّوں کا قومی گیت، نیا شوالہ، سوامی رام تیرتھ، رام، نانک، شاہین، روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے، ساقی نامہ کے منتخب اشعار، بالِ جبریلؑ کی غزل نمبر ۷ (تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن)، بالِ جبریلؑ ہی سے غزل نمبر ۴۰ (ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں)، سلطان ٹیپو کی وصیّت، شعاعِ امّید (ضربِ کلیم) جیسی نظموں کا ایک سرسری مجموعہ تیاری کے مراحل میں ہے۔ یہ کام اپنے آپ میں مکمل نہیں ہے، لیکن شخصیت سازی (Personality Development)، حب الوطنی، انسان دوستی، خوردنوازی، حرام اور حلال میں تمیز، زندگی اور حرکت، پیکار اور پیہم کار، نیز خود احتسابی اور جوابدہی جیسی صفات کی تعمیر میں اقبال کی یہ نظمیں نہایت مثبت کردار ادا کرتی ہیں، جن کی صرف افواج کو ہی نہیں بلکہ کسی بھی بڑے نظام کے اعلیٰ افسران کو ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔

یہ بات نہایت وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ بھارتی افواج کا مزاج اور افتاد سیکولر ہے۔ اس تناظر میں جب کلامِ اقبال کا مطالعہ کیا گیا تو پتہ چلا کہ اقبال کا ۹۹ رفیصد کلام سیکولر ہے اور بلا جھجک کسی بھی غیر مسلم مجلس میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ بعض نظمیں جن کا تعلق خالص اسلامی روایات اور عقائد سے ہے مثلاً بلادِ اسلامیہ، ایک حاجی مدینے کے راستے میں، غرّہ شوال، خضرِ راہ، طلوعِ اسلام، مسجدِ قرطبہ، ہسپانیہ اور اسی قبیل کی چند ایک اور نظموں کے علاوہ اقبال کا پورا کلام علوئے انسانیت اور شرفِ آدمیّت کا پیغام دیتا ہے۔ وہ مضمحل اور مایوس دل کو زندگی کا ایک نیا موڑ عطا کرنے میں اکسیر ہے۔ اقبال مایوسی اور قنوطیت کے دشمن اور امید و اقبال مندی کے موئد و حمایتی بلکہ داعی ہیں۔ مایوسی اور فرار ایک ایسا ناسور ہے جو اکثر دفاتر میں کام کرنے والوں کو اپنی چپیٹ میں لیتا رہتا ہے۔ جو لوگ مذہبی کتابوں اور عبادات سے کم ربط رکھتے ہیں انھیں یہ نفسیاتی عارضہ ہر وقت لاحق رہتا ہے۔

راقم نے کلامِ اقبال کا مختلف سطحوں پر تجربہ کیا ہے۔ سرکاری دفاتر میں اعلیٰ افسران

کی رشوت ستانی اور لال فیتہ شاہی نے عوام ہی نہیں بلکہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی چولیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ قانون اُس جگہ کارگر ہوتا ہے جب مجرم پکڑا جائے۔ مجرم اگر پوشیدہ ہو اور اسے قانون کی نظر سے اوجھل رکھنے کے تمام انتظامات بھی اگر انتظامیہ (System) خود انجام دے تو قانون کوئی خودکار مشین نہیں ہے کہ اپنے آپ چل کر آئے اور عہد شکن کو گرفتار کر کے قرارِ واقعی سزا دے۔ چھوٹے آدمی کا جب ضمیر مُردہ ہو جائے تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ کرے گا کہ بھیک مانگ کر اپنی ضرورتیں پوری کر لے۔ لیکن جب کسی اعلیٰ افسر Bureaucrat کا ضمیر مُردہ ہو جائے تو وہ ویرپّن سے زیادہ خطرناک اور ڈاکو سے زیادہ ظالم ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی حرص و ہوس کے آگے اپنے ملک و وطن کی عزّت و احترام کا بھی سودا کر لیتا ہے۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے اپنے افسران کی نفسیاتی تربیت کے لیے متعدد قدم اٹھائے ہیں۔ اس میں سب سے بڑی کوشش خود مرکز کے اعلیٰ افسران نے اپنے ماتحتوں کی رہنمائی کے لیے محضرِ اخلاقیات و اقدار (Charter of Ethics) تیار کیا ہے۔ اس چارٹر کی تیاری کے دَوران راقم کی خدمات بھی لی گئیں۔ قرآنِ حکیم اور اسلامی تاریخ وروایات کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کے علاوہ راقم نے کلامِ اقبال سے بھی مختلف حوالے دیے جنھیں بہت پسند کیا گیا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بیوروکریسی کی اعلیٰ نشستوں کے دَوران کئی کئی مرتبہ کلامِ اقبالؔ کی فہمائشی مجلسیں منعقد ہوئیں جن میں ''شاہین'' اور ''تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن'' جیسی نظمیں بالکل اُس سطح سے پڑھائی گئیں جو مرکزی اور ریاستی اعلیٰ حکّام کے معیار کا حق تھا۔

راقم نے اقبالؔ کو مختلف جہتوں پر پڑھایا ہے اور ہر بار بڑے اچھے نتائج کا تجربہ کیا ہے۔ مسوری میں ''لال بہادر شاستری اکیڈمی آف ڈولپ منٹ ایڈمنسٹریشن'' واقع ہے۔ مجھے وہاں بعض مرتبہ ہفتوں قیام کرنا پڑا ہے۔ چارٹر آف اتھکس کے کورس کی تیاری کے سلسلے

میں بھی اور وہاں چلنے والے مختلف کورسوں میں اپنے محاضرات (Lectures) پیش کرنے کے سلسلے میں بھی۔ یہی وہ اکیڈمی ہے جہاں تمام آئی اے ایس، آئی پی ایس اور آئی ایف ایس افسران تیار کیے جاتے ہیں اور ان کا فاؤنڈیشن کورس ہوتا ہے۔ ڈگریاں ملنے کے بعد یہ طلبہ اپنی اپنی متعلقہ ریاستوں میں پہنچتے ہیں اور پروبیشنرز (Probationers) کہلاتے ہیں۔ اسی اکیڈمی سے انھیں پورے ملک کی سیر کے لیے بھی بھیجا جاتا ہے، تاکہ وہ اپنے وسیع وعریض بھارت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر سکیں اور اُس کے حسنِ بے پروا کو جلوؤں میں چھپا ہُوا دیکھ سکیں۔ یہیں انھیں آدابِ جنوں بھی سکھائے جاتے ہیں اور پروبیشن کا دور ختم ہونے کے بعد جب وہ مرکز کے یا کسی ریاست کے ذمہ دار افسر کی حیثیت سے کلکٹر، کمشنر یا ڈائرکٹر اور سکریٹری کی کرسی پر بٹھائے جاتے ہیں تو دستورِ ہند کے تحت انھیں اپنی قسم یاد رہتی ہے کہ وہ اسی بھارتی عوام کے خادم (Public Servants) ہیں جو غریبی، بھک مری، افلاس اور زندگی کی بنیادی ضرورتوں کی محتاجی سے جھوجھتی رہتی ہے لیکن اپنا پیٹ کاٹ کر سرکار کے خزانے میں ٹیکس برابر جمع کرتی ہے تاکہ اِن اعلیٰ افسران کی تنخواہوں، بنگلوں، ہوائی جہازوں کے سفروں، کاروں، بیرونی ممالک میں تربیتوں اور بھتوں کے اخراجات ماہ بماہ ادا ہوتے رہیں۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ جب کوئی لڑکا آئی اے ایس کا امتحان کامیاب کر لیتا ہے تو اس کا دماغ کس آسمان پر ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو سمراٹ اشوک اور اکبرِ اعظم سے کم نہیں سمجھتا۔ وہ اگر کسی سے دبتا ہے تو اپنے سینیئر سے۔ غالبؔ کے الفاظ میں کہنا چاہیں تو اس کی کیفیت بالکل ''نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رِکاب میں'' والی ہوتی ہے۔ وہ ہمالیہ میں واقع مسوری یعنی بھارت کی سر آنکھوں سے اترتا ہے اور اس کے جسم وجاں پر قانونی قبضے کے لیے بے تاب اور بے چین رہتا ہے۔ ابتلاء و آزمائش (Probation) کا دور گذرنے کے بعد اس کی پوری توانائی اپنے افسرِ بالا، سکریٹری اور دیگر سینیئر لوگوں کو خوش کرنے میں گذرتی ہے

اور جب اس کی پوزیشن مستحکم و مضبوط ہو جاتی ہے تو پھر وہ اچھی سے اچھی جگہ پر تقرّری اور اپنے گھر والوں کے حال اور مستقبل کو سنوارنے کے لیے وہ سب کچھ کر گذرتا ہے جس کی ایک شریف آدمی سے امید نہیں کی جا سکتی۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی اور راز کی بات نہیں ہے۔ آئے دن اخبارات اعلیٰ افسران کی ناکردگی، عدمِ توجّہی اور رشوت ستانی کی خبروں سے بھرے رہتے ہیں۔ ملک کے راز فروخت کرنے سے لے کر تو یتیموں، بیواؤں، طالب علموں، زلزلہ زدوں، سیلاب سے بچے زندوں اور مریضوں کی امداد تک ان کے پیٹ کی قبر میں دفن ہو جاتی ہے اور ''لے کے رشوت پھنس گیا ہے، دے کے رشوت چھوٹ جا!'' کی عملی تفسیر میں ان کی زندگی گذر جاتی ہے۔ اس بھیڑ میں بعض ایماندار افسران صحرا میں نخلستان کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور اُن میں سے چند ایسے بھی مخلص اور دیدہ ور افسران پیدا ہو جاتے ہیں جن کے سامنے دنیا بازیچۂ اطفال بنی رہتی ہے۔ وہ اچھے اچھوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور دستورِ ہند اور بھارتی عوام کی سچّی وفاداری اور خدمت کو ہی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ دیدہ دلیر وزراء اور راشی افسران انھیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور ان کی تقرری اور تبادلہ ایسے کوردہ، بے آب و گیاہ اور خطرناک مقامات پر کرتے رہتے ہیں جہاں پہنچتے پہنچتے ویرپّن کا کلیجہ بھی پانی ہو جائے اور اچھے اچھے سورماؤں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں۔ بیوروکریسی کے یہی افسران حکومت کی پوری انتظامیہ کا قلب و جگر ہیں۔ انھیں کے وجود سے تصویرِ کائنات میں رنگ ہے۔ اُن ہی کے رحم و کرم سے بھارت کی گلیوں میں امن ہے، چور کا منہ کالا ہے اور سچ کا بول بالا ہے۔ سرحدیں محفوظ ہیں۔ اناج کے گودام سلامت ہیں، دریاؤں اور نہروں میں جو تھوڑا بہت پانی بہتا نظر آتا ہے اور زلزلے میں کچھ عمارتیں گرنے سے بچ جاتی ہیں، اکثر سڑکیں صاف ستھری ہیں، گندے پانی کی نالیاں بہتی نظر نہیں آتیں اور ریلیں روزانہ ٹکرانے کی بجائے وقت پر چلتی ہیں، یہ سب ان ہی کی شبانہ روز محنتوں کا نتیجہ ہے۔ یہ افلاطون کی کتابِ

لامقام (Utopia) تحریر کرنے کی بجائے اس کا مطالعہ کرتے ہیں اور خوب سے خوب تر انتظامات کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ یہی اچھا انتظامیہ بھارت کے جسم کا ڈھانچہ (Skeleton) ہے لیکن...... صاحبِ نظراں کا کہنا ہے کہ یہ ڈھانچہ بھی چرمرا کر گرنے والا ہے اور پتہ نہیں کب اڑاڑ ادھم سے پورا جسم نیچے آرہے اور اس کا رشتہ جاں سے الگ ہو جائے.......... اقدار و اخلاقیات کے تمام دُروس اور کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لینے کی سفارشات اور محضرِ اخلاقیات (Charter of Ethics) کا بوجھ بھی ان ہی کے کندھوں پر رکھنے کی کوششیں ہو رہی ہیں اور ان کی تربیت اس طرح کیے جانے کی سفارشیں ہو رہی ہیں کہ جب یہ انتظامیہ میں آنے والی نئی پود کی کمان سنبھالیں تو اس پوزیشن میں ضرور ہوں کہ انھیں سب کچھ اچھا کرنا آتا بھی ہو اور انھوں نے سب کچھ اچھا کیا بھی ہو۔ اقبالؔ کے الفاظ میں ان میں ''قلبِ صمیم'' پیدا کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ صرف اسی پر بس نہیں بلکہ :

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا!

کرنے کی کوشش بھی جاری ہے۔ مسوری کے دورانِ قیام میرے تجربات بڑے متنوع رہے ہیں۔ اکیڈمی کی نشستوں کے دوران کئی اجلاس صرف اقبالؔ کو سننے کے لیے رکھے گئے۔ کورس کے لیے آئے ہوئے بڑے افسران کے علاوہ وہاں موجود طلبہ اور اساتذہ نے بھی بڑے پیمانے پر شرکت کی۔ بہت سے طلبہ ایسے بھی پائے گئے جنھوں نے اپنا اوریجنل کلاس ناغہ (Bunk) کیا تھا۔ بہتوں نے اپنے اساتذہ سے اجازت لی تھی۔ جن دفتری اہلکاروں نے اوّلین نشست کا انتظام کیا تھا وہ سمجھے کہ شاید غزل گائیکی کا پروگرام ہے۔ ڈنر کے لیے جاتے ہوئے محض اپنی تسلّی کے لیے جب ہم نے ہال دیکھنا چاہا تو میں دھک سے رہ گیا۔ نہایت

LIBRARY

خوبصورت کوٹھی میں ایک طرف ڈرائنگ ہال، دوسری طرف مے کدہ، درمیان میں نہایت شاندار ہال، کرسیاں اور اربابِ اقتدار کی نشستوں کے لیے صوفے پڑے ہوئے۔ نسبتاً کم بلندی کا اسٹیج، بہت عمدہ فرش فروش سے آراستہ سازندوں کے لیے دونوں پہلوؤں پر سجے ہوئے تخت اور گویّے کے لیے وسطی نشست، نہایت معزّ ز اور آراستہ تر:

یاران مرا غزل خوانے شمردند

پروگرام کے لیے جو سرکولر جاری کیا گیا تھا اس کی لفظیات بھی کچھ ایسی ہی تھیں کہ گمان ہوتا تھا یہ ''پیامِ تغزل'' ہے۔ مجھے آناً فاناً پورا سِی ٹِنگ ارنجمنٹ (Seating Arrangement) بدلوانا پڑا۔ خود کے استقبال اور لمبے چوڑے تعارف کے بعد جب راقم نے ''بالِ جبریل'' کی مشہورِ زمانہ نظم ''شاہین'' کو پنجوں سے پکڑا اور اس کے پروں کو پھڑ پھڑا کر فضا میں بلند کیا تو لگا کہ پوری وادی پر شاہین کی حکمرانی ہے اور وہ باطل کے خلاف اعلانِ جنگ کر چکا ہے ؎

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانا

جیسے اشعار سُن کر حاضرین کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ ایک لمحے کے لیے اپنے وجود سے بے خبر ہو گئے۔ انھوں نے اقبالؔ کا صرف ترانہ سُنا تھا۔ وہ بھی بعض تحفظاتِ ذہنی کے ساتھ۔ وہ اقبالؔ کے وجود کے مرکز سے دوُر تھے۔ اقبالؔ کے فکری دریچوں میں جب انھیں جھانکنے کا موقع ملا تو یہ گویا اُن کے لیے نئی دریافت تھی۔ اب تک انھوں نے اُردو شاعری کو صرف موسیقی اور مزامیر کے سہارے سنا تھا۔ انھوں نے مغنّی کی آواز اور گلے کا زیروبم دیکھا تھا اور اسی کی تعریف کی تھی۔ وہ طبلے کی تھاپ پر جھومے تھے۔ سَرگم کے سُروں اور آلاتِ موسیقی کے لاؤ لشکر میں 'لایعنی' اور 'بامعنی' الفاظ میں اب تک تمیز نہ کر پائے تھے۔ اشعار

پھولوں کے تختے ہیں۔ وہ سمرقند اور بخارا کی گلیاں ہیں کہ ہر موڑ پر نئے منظر کھلتے اور گلاب کی کلیاں کِھلتی ہیں۔

راقم نے بتایا کہ ہر ملک اور قوم کا ایک قومی پرندہ یا جانور ہوتا ہے۔ جیسے بھارت کا مور، روس کا بھالو، چین کا پینڈا۔ بالکل اسی طرح تقریباً ہر مفکّر شاعر کے یہاں کسی فرضی پرندے کا وجود پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آریائی روایات اور مذہبی کتابوں میں بھی پرندوں کا ذکر ہے جیسے راماین میں گروڑا جس کا نام جٹایو تھا۔ راماین نگاروں نے گروڑا کو نیکیوں کا مُعاون اور بدیوں کا دشمن بتایا ہے۔ یہ سیتا کی خبر لاتا بھی ہے اور اس کی خبر گیری پر مامور بھی ہے۔ جس سے برہم ہو کر راون نے ایسا وار کیا تھا کہ جٹایو کا ایک بازو ٹوٹ گیا۔ یہ بہت وجیہہ اور جسیم پرندہ ہے اور اس میں کئی لوگوں کو اپنی پیٹھ پر سوار کر کے اڑا لے جانے کی صلاحیت بھی ہے۔ انگریزی شاعر کیٹس (Keats) نے بھی اپنے Sonnets اور دیگر نظموں میں چکور (Nightingale) کو اپنا پیغامبر اور قاصِد بنایا ہے۔ اس نشست میں شاہین کا تعارف کرواتے ہوئے پہلی مرتبہ فرضی پرندوں کی فہرست کے دوران یہ بتایا گیا کہ ولیم شکسپیئر کا Phoenix دراصل ایک عربی تصوّراتی پرندہ ہے اور اس کا عربی تلفظ قَقنس ہے۔ اس کی عمر ۵۰۰/تا ڈیڑھ ہزار سال ہوتی ہے۔ جب یہ اپنے دورِ حیات کے آخری حصے میں پہنچتا ہے تو معطّر شاخوں سے اپنا آشیانہ بناتا ہے اور اس میں بیٹھ کر مَوت کا نغمہ چھیڑ دیتا ہے۔ اس کی چونچ سے ہزار سُر اُبلتے ہیں اور یہ اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتا جاتا ہے یہاں تک کہ گھونسلے کی تیلیاں جل اٹھتی ہیں اور یہ خود اپنی ہی بنائی ہوئی چِتا کی آگ میں جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔ جب صدیاں گذر جاتی ہیں تو اِسی راکھ سے ایک انڈا تشکیل پاتا ہے اور قَقنس دوبارہ وجود کے جامے میں زندہ ہو اٹھتا ہے۔

ڈاکٹر علامہ اقبالؔ کا شاہین زندگی، حیات، بیداری، رزقِ حلال، جہدِ مسلسل، پے

کار، پیہم کار، وسعتِ نظر، بلندی، بلند حوصلگی، عدمِ آشیاں سازی، خودداری، سیر چشمی، شوکت، صبر، قناعت اور درویشی کی علامت ہے۔ وہ بہت بلند اُڑتا ہے۔ اُسے شکارِ زندہ کی لذّت نصیب ہے۔ اس کی نگاہ اتنی تیز ہوتی ہے کہ وہ دریا کی تہہ میں پڑا ہوا بال دیکھ لیتا ہے۔ اس کی فطرت لہو ترنگ ہے، جل ترنگ نہیں۔ وہ آشیانہ نہیں بناتا۔ آبادیوں کے جھمیلوں میں نہیں رہتا۔ قصرِ سلطانی کے گنبد تلے آشیاں سازی نہیں کرتا۔ دوسرے پرندوں کی طرح بیٹھے نغمے اَلاپ کر دانہ دنکا ڈالنے والے سخیوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتا۔ وہ پڑا جھڑا نہیں کھاتا۔ خیابانیوں سے پرہیز کرتا ہے۔ وہ اپنے بچّوں کو بھی یہ صلاح دیتا ہے کہ ؂

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزہ ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں!

یہاں ایک بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس نظم کے ایک شعر میں ''خیابانیوں'' کی اصطلاح اقبالؔ نے استعمال کی ہے ؂

خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم
ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ

اکثر لوگوں نے خیابانیوں کو خیابان (Avenue) یعنی باغ کی روشیں یا درختوں کے جھنڈ سے ڈھنکا ہوا راستہ سمجھا ہے۔ لیکن یہاں اِس سے مُراد خیابان میں رہنے والوں سے ہے۔ شاہین بمقابلہ وہ پرندے ہیں جو باغوں میں بسیرا کرتے ہیں، مثلاً طوطا، مینا، مور، بلبل، کوئل، پپیہے، عندلیب، تغدار، چڑیاں وغیرہ۔ جب اِن کیفیات کو افراد پر منطبق کیا جائے تو وہ لوگ نکل آتے ہیں جو سہل طلب، لذّت کوش، آرام طلب اور عیش کوش واقع ہوئے ہیں۔ شاہین اِن سے بچ کر رہنے کی تلقین کرتا ہے کیونکہ اُن کی ادائیں اتنی دلربا، اور انداز اتنے دلبر ہوتے ہیں کہ اچھے اچھوں کے قدم بہک جائیں۔ لذّت کوشی دراصل ایک طرح کی غلامی ہے جس میں

صحرا جیسی آزادی کہاں؟ خیابانوں میں نہ سورج کی تمازت ہے نہ بادِ سموم کے جھکڑ نہ بھوک اور پیاس کی شدّت ہے۔ حکمرانی کا حق اُسی کو ہے جو فطرت کی سختیاں جھیل سکتا ہو اور نرم بچھونوں کا عادی نہ ہو۔ بادشاہوں کی پرورش میدانِ جنگ میں اور شہنشاہوں کی پرورش صحراؤں میں ہوتی ہے۔ جو زندگی کی کٹھنائیوں کو جھیلنے کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں وہی مشکل موقعوں پر قوم کی رہبری کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔ شاہین کی اس سخت کوشی نے اعلیٰ افسران کی مجلس میں نئے آفاق کھول دیے۔

اسی نظم میں اقبالؔ کے ''تصوّرِ رزق'' کا بھی نہایت حسین انداز میں اجراء ہوا ہے۔ پہلا ہی شعر ہے۔

کِیا میں نے اُس خاکداں سے کنارا
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانا

ملازمتوں کا پورا نظام دراصل پیٹ کے گرد چکر لگاتا ہے۔ اسی کی تفصیل بتاتے ہوئے جب میں نے کہا کہ:

''جو کچھ کروں گا پیٹ کے لیے کروں گا، پیٹ کے سِوا کچھ نہ کروں گا!''

تو آپ یقین جانیں پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ انھیں بتایا گیا کہ رزق (Sustenance) کو لوگ صرف آب و دانہ ہی سمجھ بیٹھے ہیں۔ حالانکہ رزق ایک نہایت ہی وسیع و عریض تصوّر کا نام ہے۔ آپ کی معاشی ترقی، آپ کی تعلیمی ترقی، آپ کی معاشرتی ترقی، آپ کی سماجی ترقی، آپ کی روحانی ترقی، یہ ادارے، یہ درودیوار، اعلیٰ تصورات، یہاں تک کہ آپ کا لباس، آپ کے پیروں کے چپل، جوتے، آپ کے اساتذہ، آپ کی کتابیں، آپ کا اقتدار، ریلوے اور ہوائی جہاز کا OK ٹکٹ، مُردوں کے لیے کفن اگر مُردوں کا رزق ہے تو تدفین اور کریا کرم کا پورا عمل زندوں کے لیے رزق ہے اور بقول حکیم الامت حضرت مولانا

قاری محمد طیّب صاحبؒ ''گرمیوں میں ٹھنڈا پانی اور ٹھنڈیوں میں گرم پانی بھی رزق ہے۔''
پھر یہ کہ رزق بھی دو طریقوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ایک حلال (Legitimate)
دوسرے حرام (Illegitimate) یا (Unlawful) طریقوں سے۔ ایک طریقہ میز کے اوپر
سے رزق حاصل کرنے کا ہے، دوسرا میز کے نیچے سے۔ ہمیں رزق کے تصورات
کو بدلنا ہوگا۔ اُسے پیٹ یعنی روٹی، کپڑا اور مکان کی تنگنائیوں سے نکال کر परिभाषाओं
کائنات کی وسعتوں میں تلاشنا ہوگا۔ تب کہیں جا کر ملک اور قوموں کی تقدیریں بدل سکتی ہیں
اور کوئی قوم عالمی قیادت کے منصب پر فائز ہوسکتی ہے۔

نام نہاد سیکولر اداروں اور ایجنسیوں کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے۔ اخلاقیات کا سب سے
بڑا سرمایہ عالمی مذاہب میں ہے۔ لیکن حیرت انگیز طور پر ان اداروں میں مذہب یا مذہب کے
حوالے سے کوئی چیز پڑھانا قابلِ گرفت جرم ہے۔ ایک اعتبار سے یہ اچھا بھی ہے۔ اس سے
ہمارے ملک کے سیکولر رشتوں کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ مذاہب کے بعد اخلاقیات کا بڑا
سرمایہ فلسفیوں کے پاس ہے۔ جب کسی علمی مجلس میں فلسفے کا ذکر کیا جائے تو ذہن فوری طور پر
افلاطون، فلاطینوس، ارسطو، جالینوس، کانٹ، ہیگل، برگساں، نیٹشے، برٹ رینڈ رسل اور اسی
قبیل کے بقراطی ناموں کی طرف جاتا ہے۔ انھیں انگریزی میں مغربی فلسفی (Western
Philosophers) کہتے ہیں۔ لیکن جب اسلامی فلسفے کا ذکر ہو اور مغرب کہا جائے تو اس سے
مراد حجازِ مقدّس کے مغرب میں یعنی لیبیا، ترکی، مراکش اور اندلس وغیرہ میں پیدا ہونے
والے حکماء سے ہے۔ جیسے ابنِ خلدون، ابنِ رُشد، فارابی وغیرہ کا شمار ان ہی مغربی
فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ اسی طرح فلسفے میں جب مشرق کہیں تو اس سے مراد مشرقی فلسفے سے
ہوگی، یعنی امام غزالی، امام ابنِ تیمیہ، امام بوحنیفہ، ڈاکٹر علامہ اقبالؔ وغیرہ۔ آج کی
یونیورسٹیوں میں جس طرز کی تعلیم عام ہے اس نے اسلام اور اسلامی فلسفے کو سرے سے غائب

کرر کھا ہے۔ اگر بہت فراخدلی کا مظاہرہ کیا گیا تو اتنا ہوا کہ کورس میں الغزالی، فارابی اور خلدون جیسے دو چار نام شامل کر لیے۔ جو دراصل صرف منہ کا مزہ بدلنے اور اپنے آپ کو سیکولر ثابت کرنے کے کام آتے ہیں۔ لیکن اس فہرست میں بھی اقبالؔ کا دوٗر دوٗر تک پتہ نہیں۔

ہم لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اُردو معاشرے میں اقبالؔ آشنا خال خال ملتے ہیں جو اقبالیات کے رمز آشنا ہیں۔ ان کے دام اتنے زیادہ ہیں کہ ہر ادارہ اپنے Routine لکچرس کے لیے ان کی آمدورفت اور Fees کے خرچ کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس اُلجھے ہوئے ماحول میں گو کہ اقبالؔ صرف دستگیری ہی نہیں بلکہ فلسفیوں کے جمِ غفیر کی قیادت کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن ہم محض اپنی کوتاہ دستی اور کم علمی کی وجہ سے اس نعمتِ غیر مترقبہ سے محروم ہیں۔ راقم کی کوتاہیاں بھی اپنے آپ میں ایک ریکارڈ ہیں۔ اقبالؔ کو پڑھا ہے بلکہ پڑھایا بھی ہے لیکن فلسفے سے دوٗر کا بھی واسطہ نہیں۔ وہ اپنی عقلِ سلیم کے زور پر اقبالؔ کے اُردو فارسی کلام سے اخلاقیات اور اقدار کی جو بھی گتھی سلجھائی جاسکتی ہے اُسی کے لیے کوشاں رہنا اپنے فرض کا ایک جزو سمجھتا ہے۔

آپ کہیں گے کہ اخلاقیات اور اقدار کے دفاتر تو سعدیؔ شیرازی کی حکایتوں میں بھی بھرے پڑے ہیں۔ اقبالؔ کی کیا ضرورت؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ معرکے صرف میدانی ہی نہیں ہوتے، علمی بھی ہوا کرتے ہیں، جہاں مِگ کے مقابلے میں مِگ اور میزائل کے مقابلے میں میزائل لانے پڑتے ہیں۔ جب کوئی ہند آریائی فلسفے کے حوالے سے گائے کے تقدس اور اس کی عزت مآبی پر بات کرتا ہے تو مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی :

رَب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

کو لانا ہی پڑتا ہے۔ پھر یہ کہ سعدی شیرازی اور مولانا رومؔ کا کلام فارسی میں ہے۔ اگر انھیں

پیش بھی کرنا ہے تو انگریزی تراجم کی مدد لینی پڑتی ہے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں ترجمے کی اپنی تحدیدات ہیں۔ اس کے برخلاف اقبالؔ کو پیش کرنا اس لیے بھی ضروری اور آسان ہے کہ اُن کا اُردو اور فارسی کلام اور انگریزی کام موجود ہے۔ کم از کم آسان اُردو تو ہر کوئی سمجھ لیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اصل کلام کو سامنے رکھ کر پڑھایا جاسکتا ہے اور اگر کوئی اسے چھونا بھی چاہے تو بلا تکلّف قاری کی حِس لامسہ بھی اس سے سیراب ہو سکتی ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، اقبالؔ کا پورا کلام سیکولر ہے، سوائے چند ایک نظموں کے جن میں اسلامی عقائد اور تاریخ کا ذکر ہوا ہے۔ اگر عملی طور پر بھی دیکھا جائے تو ہر جگہ اور ہر وقت قرآن نہیں پڑھایا جاسکتا۔ ہر جگہ اسلامی عقائد و عبادات کو زیرِ بحث نہیں لایا جاسکتا۔ کھانے پینے کے اسلامی آداب ہو سکتے ہیں لیکن کاشتکاری کے اسلامی آداب کوئی معنیٰ نہیں رکھتے۔ اگر تجارت اور کاروبار حلال اور جائز طریقوں سے ہو تو آپ کفار و مشرکین کے ہاتھ کا پکّا ہوا بھی کھا پی سکتے ہیں، بلکہ اُن کے گھروں میں بیٹھ کر کھا سکتے ہیں۔ لیکن اگر اکلِ حلال میں شبہ ہے تو آپ ایک مسلمان کے گھر میں بھی کھا نہیں سکتے۔ انسان سازی اور شخصیت میں نکھار پیدا کرنے کے لیے زندگی کے اچھے پہلوؤں کو اُجاگر کرنا ہوتا ہے اور اچھی زندگی گذارنے پر زیرِ تربیت فرد کو آمادہ کرنا پڑتا ہے۔ کمھار ایک ایک برتن کو اور سُنار ایک ایک زیور کو بلکہ اس کے ایک ایک زاویے کو نکھارتا اور ابھارتا ہے۔ بھٹّی میں پکاتا ہے تب کہیں جا کر مٹّی کا مول اور سونے کا دام بڑھتا ہے۔ انسان سازی اس عمل سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ اقبالؔ بھی فرد کی ترقی کو سماج کی ترقی سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے فارسی اور اُردو کلام میں جہاں جہاں 'جاوید سے' خطاب کیا ہے وہ دراصل نوجوانوں سے خطاب ہے۔ نیک روی، پامردی، غیور پن، خودداری، اعتماد، قربانی، وفاداری، وفاشعاری، راست گوئی، اکلِ حلال کی جستجو، سنگلاخ زمینوں سے چشمے اُبالنے اور ریگزاروں کو گلزار بنانے کا کام نوجوان ہی

کر سکتے ہیں۔ عمر کے آخری حصے میں اقبال اپنے آپ کو شاخِ تاک (انگور کی ٹہنی) کہتے ہیں اور اپنے کلام کو شاخِ تاک کا پھل کہتے ہیں۔ اس پھل سے وہ نوجوانوں کو سرخ سرخ شراب کشید کرنے کی ہدایت کرتے ہیں ؎

میں شاخِ تاک ہوں، میری غزل ہے میرا ثمر
مری غزل سے مئے لالہ فام پیدا کر

پنچگنی (مہاراشٹر) میں سینٹر فار مارل ری آرمامینٹ (ایم آر اے) نامی ایک بین الاقوامی ادارہ ہے۔ اب اس کا نام بدل کر ''ایشیا پلیٹو (Initiative For Change)'' رکھ دیا گیا ہے۔ کوہِ سہادری کے خنک ماحول میں آسٹریلیائی حکومت اور ایجنسیوں کے تعاون سے اس کی تعمیر ہوئی ہے۔ اس کا معیار، ماحول اور کیفیت نیز رہائشی جزئیات کو عالمی سطح کے مطابق رکھا جاتا ہے۔ اس کو قائم کرنے میں گاندھی جی کے پوتے راج موہن گاندھی کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس ادارے میں کل ہند اور بین الاقوامی سطح کے مختلف کورس سال بھر جاری رہتے ہیں، جن میں ملکی اور بیرونی طلبہ، ذمہ داران اور کمپنیوں کے بڑے بڑے ڈائرکٹر نیز مختلف میدانوں میں کام کرنے والے شہرہ آفاق افراد تربیت کے لیے آتے ہیں۔ یہاں چند دن رہ کر وہ مشرقی اور مغربی اچھائیوں کو پڑھتے ہیں اور زندگی کو برتنے کا سلیقہ سیکھتے ہیں۔ آفاتِ سماوی سے لے کر آفاتِ نفس تک سے نمٹنے کے اسرار و رموز یہاں نہایت تجربہ کار اور انسانی اذہان کے میدانوں میں کام کرنے والے لوگ انھیں بتاتے ہیں۔

کرائسیس مینجمنٹ، ڈزاسٹر مینجمنٹ، مارل بریک ڈاؤن، ٹائم مینجمنٹ، سائکولوجکل ری آرمامینٹ، ایڈمنسٹریشن، مارل سائنسز، پرسنالٹی ڈولپ منٹ، لیڈرشپ، پرو ایکٹیونیس، میموری، میڈی ٹیشن (مراقبہ)، سیلف رلائنس (خود اعتمادی)، ماحولیات، فطرت سے محبت، انسانیت نوازی، علوئے انسانیت، حب وطن، سادہ زندگی، اخلاقیات، احترامِ آدمیت

، آفاقیت، یک جہتی، اتحاد بین المذاہب، عصری مسائل اور اسی طرح کی لاتعداد روایتی اور غیر روایتی باتیں یہاں پڑھائی اور انھیں عملی طور پر برت کر بتائی جاتی ہیں۔ بیرونی ملکوں کے نفسیاتی مرض کے شکار اسکولوں اور کالجوں کے بچے اور گاندھیائی اور بھارتی فلسفے پر تحقیق کرنے والے ریسرچ اسکالرز بھی یہاں نہایت اونچی فیس ادا کر کے طویل قیام کرتے ہیں اور ذہن سازی مکمل ہونے کے بعد اپنے ملکوں کو لوٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح کے کورس سے خطاب کرنے کے لیے راقم کو بھی کئی مرتبہ مدعو کیا گیا ہے۔ کئی نشستوں میں شرکاء سے خطاب کرنا پڑتا ہے۔ پہلے سے ہی انھیں کہہ دیا جاتا ہے کہ ایک نشست کلامِ اقبالؔ سے متعلق بھی ہوگی۔ ایک مرتبہ سینٹرل ہال میں اس خصوصی نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔ نشست چونکہ رات کے کھانے کے بعد تھی اور اس کا خصوصی طور پر اعلان بھی کیا گیا تھا اس لیے ادارے کے ذمہ داروں اور فیکلٹی کے علاوہ راج موہن گاندھی خود مع اپنی اہلیہ کے اور بیرونی ممالک کے تقریباً تمام نوجوان جلسے میں شریک رہے۔ جلسہ اپنی کیفیت اور کمیّت کے اعتبار سے اقبالؔ کے شایانِ شان تھا۔

حیرت اس وقت ہوئی جب دوسرے روز ہماری قیام گاہ پر بھی اور ناشتے کے دوران بھی ملک اور بیرون ملک کے چند نوجوان باقاعدہ وفد کی شکل میں ملاقات کے لیے آئے اور گفتگو کے لیے الگ سے وقت مانگا۔ بیرونِ ملک کے نوجوانوں کے لیے اقبالؔ پہلی اور اجنبی آواز تھی۔ اسی طرح ملک بھر سے آئے ہوئے ۴۰/نوجوان دراصل ایک بہت بڑے یوتھ کیمپ کی ایڈوانس پارٹی تھی۔ اُن کے لیے بھی اقبالؔ کی آوازِ فکر کے سناٹے کو بجلی کے کوندے کی طرح چیر ڈالنے والی کوئی شے تھی۔

بیرونِ ملک کے نوجوانوں نے متعدد نشستوں میں اقبالؔ کے فلسفۂ خودی، فلسفۂ وطن اور مغرب سے متعلق اقبالؔ کے خیالات کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ مجھے حیرت اس

وقت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ ان کی بیاضوں میں اس سے پہلے دیئے لکچرز کے نوٹس تھے اور اب بھی جو کچھ کہا جا رہا تھا اسے لکھتے جاتے تھے۔ اُردو اور فارسی اصطلاحوں کو ادا کرنے کی مشق کرتے اور اس بات پر تاسُّف کا اظہار کرتے کہ انھیں فارسی اور اُردو کیوں نہیں آتی۔ میں نے انھیں چند انگریزی کتابوں کے نام لکھوا دیے اور اقبالؔ کے انگریزی لکچرس پڑھنے کی تلقین کی۔

یوتھ کیمپ کے ذمہ داروں نے اصرار کیا کہ یہ جو چالیس نوجوان لڑکے لڑکیاں آئے ہوئے ہیں دراصل گروپ لیڈرس ہیں، اور ہر ایک کی زیرِ قیادت ۱۰۰ ؍سو سے زائد طلبہ ہیں جو ملک کی مختلف یونیورسٹیوں سے یہاں پہنچنے والے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان گروپ لیڈرس کے لیے ایک محاضرہ الگ سے دیا جائے اور ان کے مختلف سوالوں کو attend کیا جائے۔ راقم کا چونکہ واپسی کا پروگرام بن چکا تھا اور ہم pack up کے مرحلے میں تھے۔ ایسے وقت میں ان کا اصرار اور اپنے اگلے پروگراموں کو ازسرِ نو مرتب کرنا بڑا مشکل معلوم ہوا۔ لیکن جو لوگ عوامی رابطے کے کاموں سے واقف ہیں وہ میری اس بات پر یقین کریں گے کہ اگر لاکھوں روپے خرچ کر کے بھی اقبالؔ کے نام پر ان لوگوں کو جوڑنے کی کوشش کی جاتی تو شاید اتنی کامیابی نہ ملتی کہ نوجوانوں کے دِل میں یہ عندیہ پیدا ہو اور اردو، فارسی، اسلامی ادب، تہذیب اور فکر و فلسفے کو سمجھنے اور اس سے اکتسابِ نور کے لیے بے چین نظر آئیں۔ اس گروپ میں شاید ہی کوئی لڑکا مسلمان یا اُردو فارسی سے واقف رہا ہوگا۔ اعلیٰ صلاحیت والے ان نوجوانوں کے سامنے جان بوجھ کر آسان اردو زبان کا استعمال کیا گیا جسے میں عام طور پر زی ٹی وی کی زبان کہتا ہوں۔ اس سے اجلاس کی کیفیت دوبالا ہوگئی۔ جب راقم نے ''ساقی نامہ'' کے ابتدائی اشعار پڑھنے شروع کیے تو بعض نوجوانوں کی آنکھیں سراپا نظارہ ہوگئیں۔ بعض کے ہونٹ اور چہرے حیرت و استعجاب کے عالم میں گول ہوگئے۔

بعض کو دیکھ کر یوں محسوس ہوا کہ ابھی اٹھ کر رقص کرنے لگیں گے۔ انھوں نے اب تک بھجن منڈلی، قوّالی اور غزل کی محفلوں کو سُنا تھا اور بھگتا تھا، اقبالؔ ان کے لیے ایک فکری تحفے کے علاوہ ایک پُرمسرّت تجربے سے کم نہ تھا۔ چند اشعار سُن لیجیے :

ہُوا خیمہ زن کاروانِ بہار — اِرم بن گیا دامنِ کوہسار!
گل و نرگس و سوسن و نسترن! — شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن!
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں — لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں!
فضا نیلی نیلی ہوا میں سُرور — ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور!
وہ جوئے کہستاں اُچکتی ہوئی — اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی
اُچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی — بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رُکے جب تو سِل چیر دیتی ہے یہ — پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ!
ذرا دیکھ اے ساقیٔ لالہ فام — سناتی ہے یہ زندگی کا پیام!

اُٹھا ساقیا پردہ اُس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

زمانے کے انداز بدلے گئے — نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے
ہُوا اس طرح فاش رازِ فرنگ — کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ!
پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا — تماشہ دکھا کر مداری گیا!
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے — ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے!
مجھے عشق کے پَر لگا کر اڑا — مری خاک جگنو بنا کر اُڑا
خِرد کو غلامی سے آزاد کر — جوانوں کو پیروں کا استاد کر

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے مرا عشق، میری نظر بخش دے

اور پھر یہ اشعار :

دمادم رواں ہے یمِ زندگی ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

وغیرہ وغیرہ۔ طلبہ کی مانوسیت کا یہ عالم تھا کہ وہ اقبالؔ کو اپنا ہمدرد، غم خوار اور خیر خواہ سمجھنے لگے۔ اس کے علاوہ اور بھی نظموں کے ذریعے نئی نسل کو فکرِ اقبالؔ کی سیر کرائی گئی۔ بالِ جبریلؔ کی غزل ؎

تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بَن، اپنا تو بَن

والا مصرعہ تو اِن نوجوانوں میں گویا محاورہ بن گیا۔ سوالات کی بوچھار ہوگئی۔ اُن میں چند سوال یہ بھی تھے کہ اقبالؔ کو نوبل پرائز کیوں نہیں ملا؟ اقبالؔ پاکستان کیوں چلے گئے؟ پاکستان کا ترانہ کس نے لکھا؟ اقبالؔ نے پاکستان کا ترانہ کیوں لکھا؟ آپ خوب جانتے ہیں کہ یہ سارے سوالات محض لاعلمی، عدمِ واقفیت، غلط پروپگینڈے اور غلط فہمیوں کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں۔ اقبالؔ پر تصوّرِ پاکستان پیش کرنے کا الزام تو غیر مسلم تعلیم یافتہ اور ادب سے واقف طبقے میں بھی ہے۔ ظاہر ہے اِن میں سے اکثر سوال لاجواب اور اکثر باجواب ہوتے ہوئے بھی انھیں نہایت متانت اور ٹھنڈے دل سے عوام کو سمجھانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اقبالؔ کے تعلق سے اردو والوں کے لیے یہ بھی اپنے آپ میں ایک بڑا چیلنج ہے۔

اقبالؔ، ہندوستان کا وہ واحد شاعر ہے جس کے کلام کو پرائمری اسکولوں کی تیسری کلاس سے لے کر تو یونیورسٹیوں میں فلسفوں کی اونچی کلاسوں تک بلا تکلف پیش کیا جا سکتا ہے۔ اقبالؔ قومی یکجہتی کی کانفرنسوں سے لے کر تو اتحاد بین المذاہب کی عالمی مجلسوں تک میں بلا تذبذب پڑھا جا سکتا ہے۔ جو افراد قرآنِ کریم سے الرجک اور حدیث کے نام سے بنیاد

پرستی کا بہانہ لے کر دور بھاگتے ہیں انھیں اگر فکرِ اسلامی اور قرآن کے بنیادی فلسفے سے واقف کروانا ہو تو ان کے ہاتھ میں کلامِ اقبال کو پکڑوا دیجیے۔ آپ کا سارا کام آسان ہو جائے گا۔ اس کامیابی کی سب سے بڑی وجہ شاید یہ ہو کہ اقبال نے اپنے آپ کو مولانا رومؒ کا تلمیذِ معنوی تسلیم کیا ہے اور مولانا رومؒ کی مثنوی کی اساس قرآن کریم پر ہے ؎

مثنویٔ مولویٔ معنوی

ہست قرآں در زبانِ پہلوی

یہی اقبال کا وہ جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

۳؍ تا ۶؍ فروری ۱۹۹۹ء کو پونہ میں یونیسکو کی جانب سے ایشیا پیسفک ریجنل کانفرنس (Asia Pacific Regional Conference) برائے ایجوکیشن فار ہیومن رائٹس (Education for Human Rights) کا انعقاد ہوا تھا۔ اس کانفرنس میں ایک Session ''مختلف مذاہب کے تعلیمی تصورات'' پر بھی منعقد کیا گیا تھا، جہاں راقم کو ''اسلامی نظامِ تعلیم'' پر بولنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ بیس منٹ کا وقت اور Paper پہلے ہی بھجوانے کی تاکید کی گئی تھی، جو کانفرنس کے جریدے میں طبع ہوا۔ جیسا کہ عام طور پر بین الاقوامی کانفرنسوں میں ہوتا ہے، یہ وقت گھٹا کر بیس منٹ سے ۱۲؍ منٹ کا کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت میں صرف چند نکات ہی پیش کرنے کی گنجائش تھی۔ راقم نے اپنی بات اقراء ...... کے انگریزی ترجمے سے شروع کی اور صلح حدیبیہ سے ہوتے ہوئے میثاقِ مدینہ اور '' لکُم دینکم و لیدین '' پر ختم کی۔ جس میں جہالت کو تاریکی، ظلمت اور غلامی سے تشبیہ دیتے ہوئے علم کو روشنی، سچائی اور آزادی کے حصول تک پہنچایا۔ گفتگو میں تعلیم اور حصولِ تعلیم کو ''جہاد'' کے عمل سے جوڑا گیا۔ مجمع دم بخود تھا۔ دس منٹ کے اندر اپنی بات ختم کر کے بقیہ دو منٹوں میں ہلکے سے انگریزی تعارف کے بعد ڈاکٹر علامہ اقبال کی نظم ''نیا

شوالہ'' ثبوت کے طور پر پیش کی۔ ظاہر ہے یہ نظم اردو کے اصل ٹیکسٹ میں پڑھ کر سنائی گئی :

سچ کہہ دوں اے برہمن، گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہوگئے پرانے

کے بعد والے اشعار سے ہوتے ہوئے جب :

پتھر کی مورتوں کو سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھکو ہر ذرّہ دیوتا ہے

تک پہنچے تو مجمع بے حال ہو گیا۔ تالیوں کی گونج میں لگتا تھا کہ آڈیٹوریم کی چھت اُڑ جائے گی۔ سامعین میں بیٹھے ہوئے بیرونی ملکوں کے نمائندے، پتہ نہیں بات سمجھے یا نہیں، لیکن مقرر نے بین الاقوامی جھنڈوں سے گھرے ہوئے وسیع اسٹیج پر سے دیکھا کہ گوری چمڑی کے لوگ اپنے روایتی اعتراف کی آخری حدوں کو چھو چکے تھے اور وہ تالیاں بجاتے ہوئے بے ساختہ کھڑے ہو گئے تھے۔ تالیوں کے اسی شور میں راقم نے اقبال کی اس معرکۃ الآرا نظم کا آخری شعر پڑھا کہ :

شکتی بھی شانتی بھی، بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

تو ایسا لگا کہ نوجوان اور بطورِ خاص ہندوستانی طلبہ اور شرکاء آسمان سر پر گرالیں گے اور ونس مور، ونس مور کے نعروں کا ایک سیلاب لاوے کی طرح آڈیٹوریم میں بہنے لگا ہے۔

وقت ختم ہو چکا تھا۔ اقبال کا جادو اپنا کام کر چکا تھا۔ مقرر نے دیگر مقالہ خوانوں کے احترام میں اپنی بات کو یہیں ختم کر دینے میں عافیت سمجھی۔ خدا کا شکر ہے کہ تقریر بہت پسند کی گئی اور سامعین میں سے ایک نے کہا کہ، ''آپ کی گفتگو حاصلِ جلسہ تھی۔''

□□□

مُصنّف کی دیگر کتابیں

دلت مراٹھی ادب شناسی، یوپی اور مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی انعام یافتہ	۶۰/روپے
मुहम्मद पैग़म्बर علیہ السلام مراٹھی : تحقیق وتدوین	۳۰۰/روپے
مراٹھی کی دس منتخب کہانیاں، مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی انعام یافتہ	۴۰/روپے
बाबरी मशीद की राम जन्म भूमी? (مراٹھی)، تدوین، تحقیق، ترجمہ	۱۰۰/روپے
दैवी ताजमहाल مراٹھی ترجمہ	۱۰/روپے
गोष्ट : प्रेम आणि बंधुत्वाची (مراٹھی)	۱۰/روپے
कृपासागर पैग़ंबर (علیہ السلام) (مراٹھی) تدوین	۶۰/روپے
نئی پڑھائی (تعلیم بالغان کے لیے پرائمر)	۱۰/روپے
جاتک کتھائیں (۶/کتابوں کا سیٹ) انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن	۸۰/روپے
مشقی کتاب، تعلیمِ بالغان کے لیے پرائمر	۱۰/روپے
دس دن میں اردو	۱۰/روپے
گجرا (نظرثانی اور تدوین)	۲۰/روپے
جاگو اور جگاؤ (تعلیم بالغان، تدوین وترتیب)	۱۰/روپے
ہدایات برائے اساتذہ (تعلیمِ بالغان)	۱۰/روپے
جنت کی ضمانت : ضمان الفردوس کی تسہیل وترتیب	۴۰/روپے
गोहत्या : अपराधी कोण? : مراٹھی ترجمہ	۴۰/روپے
भारतीय मुसलमान (ترجمہ وتدوین) مہانو بھاؤ ایوارڈ	۴۰/روپے
تعلیم اور تعمیر حیات *(Learning To Be)* کی ترجمہ کاری میں شرکت	۸۰/روپے

The Concept of Vegetarianism in Islam	۱۰/روپے
تعلیم شناسی	۸۰/روپے
مسلم خون سے بھیگی سرحد (اردو، مراٹھی، انگریزی، عربی)	۴۰/روپے
اُردو خوش نویسی (نیشنل کونسل دہلی کے لیے خطاطی کورس کی کتاب)	۱۰۵/روپے
Muslim Blood in Defence of National Border	۴۰/روپے
इस्लाम धर्मियांचे उपवास उतणि भारतीय संस्कृति	۱۲۰/روپے
मुस्लिम बांधवाच्या रक्ताने मिजलेली सीमा आणि गैरसमज	۱۴۰/روپے
التعليم ماذاو لماذا؟	زیرطبع
دعايات مكثفة : ضد الحكام المسلمين	زیرطبع
اردو تعلیم : آج اور کل	۹۰/روپے
اقبال کا ادبی وتہذیبی وَرثہ	۱۲۰/روپے
मदरसे आणि जागतिक दहशतवाद	۱۵۰/روپے
इस्लाम धर्मियांच्या उपासना व भारतीय संस्कृती	۲۰۰/روپے
इस्लामी उपवास पहती आणि भारतीय परंपरा	۱۵۰/روپے

ان کے علاوہ ریاستِ مہاراشٹر کے سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری بورڈ اور ٹیکسٹ بک بیورو کے لاتعداد درسی کتابوں کی تدوین، ترتیب، ترجمہ اور تنقیح کاری خدمات۔

اِنڈکس (مرتبہ: مولانا محمد غفران ندوی)

شخصیات

(الف)

اللہ، آنحضرتؐ، اقبالؒ یہ نام پوری کتاب میں متعدد جگہ آئے ہیں

آرنلڈ	۵۷	آزاد (مولانا ابوالکلام)	۶۴
ایمرسن	۶۹	ابن بدرون	۶۹
آئن سٹائن	۶۹	اقلیدس	۶۹
ابوالعلامعرّی	۷۳	احمد خان (سرسید)	۷۳
امیر خسرو	۷۶	ابراہیمؑ (حضرت)	۹۹
ابنِ تیمیہ	۱۰۱،۱۴۲	اسماعیلؑ (حضرت)	۱۰۱
ایاز (محمود کا وزیر)	۱۰۲	اکبر الہ آبادی	۱۱۹
انیسی شاملو	۱۲۵	ابلیس	۱۲۵
آدمؑ	۱۳۳	امام غزالیؒ (الغزالی)	۱۴۲،۴۳
امام ابوحنیفہ	۱۴۲	ابنِ خلدون	۱۴۲،۱۴۳
ابنِ رشد	۱۴۲	ابوالحسن علی ندویؒ (سید)	۲۲
اشفاق اللہ خاں	۱۱۱	آصف علی	۱۱۱
(سید) احمد شہیدؒ	۱۱۳	(مسز) اینی بے سنٹ	۱۱۴
ابن خلدون	۱۴۲،۱۴۳	(مولانا) اسماعیل میرٹھی	۱۴۳
انیس چشتی	(کتاب میں متعدد جگہ)		

(ب۔پ۔ٹ)

بشیر احمد انصاری	۱۱	بُش (امریکہ کا موجودہ صدر)	۲۳
(پروفیسر) براؤن (ای۔جی۔براؤن)	۵۷،۷۰	برگساں (ہنری لوی برگساں)	۵۸،۹۲،۱۴۲
(حضرت) بلالؓ	۹۷	بھگت سنگھ	۱۱۱،۱۱۲
بی۔کے۔دت	۱۱۱،۱۱۲	بہادر شاہ ظفر	۱۱۳
بھا۔د۔کھیر	۸	ٹیپو سلطان	۱۱۳
بوڈن اسٹاٹ			

(ج-ح-خ)

پروفیسر جگن ناتھ آزاد ۴، ۸، ۹، ۱۰، ۱۳، ۱۶، ۱۸،
جوشؔ (شبیر حسن خاں ملیح آبادی) ۴، ۶۴، ۱۱۱، ۱۳، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹،
جوشؔ ملسیانی (پنڈت سبھو رام) ۱۷، ۱۱۸،
(حضرت) جبریلؑ ۲۸، ۳۰، ۴۹، ۵۹، ۷۵، ۹۴
جمال عبدالناصر ۴۴،
(پنڈت) جواہر لعل نہرو ۶۴، ۹۱،
جاوید (صاحبزادہ علامہ اقبال) ۴۷، ۵۳، ۵۴
حافظ الاسد ۴۴
حالیؔ (مولانا الطاف حسین پانی پتی) ۶۴، ۹۱
حسرتؔ موہانی (مولانا فضل الحسن) ۶۴
(مولانا) حسین احمد مدنیؒ ۱۱۹
(حضرت) خدیجہؓ ۲۸
(ڈاکٹر) خورشید الاسلام ۴۷

(د-ذ)

داغؔ (نواب مرزا خاں داغؔ دہلوی) ۵۷
دشرتھ ۹۲
دانتے (مشہور اطالوی شاعر) ۷۲
(ڈاکٹر) ذاکر حسین ۶، ۶۴،

(ر-ز)

(پروفیسر) رشید احمد صدیقی ۹
رام (راجہ دشرتھ کے بیٹے) ۵۸، ۶۱، ۹۲، ۱۰۲، ۱۲۵، ۱۳۳
راڈرک (رزدریق) ۹۵
زہیر بن کعبؓ ۶۹
رام لعل ۳۱
(سوامی) رام تیرتھ ۶۹، ۹۰، ۹۲، ۱۰۲، ۱۲۵، ۱۳۳
راج موہن گاندھی ۱۳۵، ۱۳۶

(س-ش)

(مولانا سید) سلیمان ندوی ۲۲
(پروفیسر) سارلی ۵۷

(شیخ) سعدالدین شبستری	۲۷	سعدی شیرازی	۱۴۳
سینٹ پال	۶۲	شکیل احمد چشتی	۳
(مولانا) شبلی نعمانی	۶۴		

(ص-ض-ط-ظ)

صدام	۲۴	(پروفیسر) ضاءالحسن فاروقی	۶
طارق ابن زیاد	۹۵،۱۰۱	(مولانا قاری) طیب صاحبؒ	۱۰۳،۱۴۲
(مولانا) ظفر علی خاں	۶۴		

(ع-غ-ف)

علی سردار جعفری	۶،۱۳۱	(ڈاکٹر) عبداللہ عباس ندوی	۹
(حضرت) عائشہؓ	۲۹	عشرت (صاحبزادہ اکبر الہ آبادی)	۴۷
(شیخ) عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لا	۶۰	(مولانا) عبدالماجد دریابادی	۱۱۹
(حضرت) عیسیٰؑ	۶۲	علی ہجویریؒ	۶۹
(مولانا) عبدالسلام ندوی	۸۹	(حضرت) عمرؓ	۹۷
غالب (مرزا اسداللہ خاں غالب)	۴۵،۵۳،۱۳۰، ۱۳۱،۱۳۵	فاطمہ بنت عبداللہ	۶۹، ۱۰۱
فارابی (ابونصر محمد بن محمد الفارابی)	۱۰۱،۱۴۲،۱۴۳	عرشؔ ملسیانی	۱۷، ۱۸

(ک-گ)

کالی داس گپتا رضاؔ	۱۷	کارل مارکس	۶۳،۷۴،۱۱۴،۱۲۵
گوئٹے (مشہور جرمنی شاعر)	۵۸،۷۱،۹۲	گاندھی جی (موہن داس کرم چند)	۶۴،۱۱۱،۱۱۳،۱۱۴
گبن (Gibbon)	۵۸	گوتم بدھ	۶۹
گوپال کرشن گوکھلے	۱۱۴		

(ل-م)

لارنس آف عربیہ	۴۴	لینن (انقلاب روس کا معمار، اشتراکی روس کا پہلا صدر)	۱۱۴
محمد ﷺ	(کتاب میں متعدد جگہ)	(حضرت) موسیٰؑ	۳۰

(حضرت) میمونہؓ	۳۴	(شمس العلماء سید) میر حسن	۶۹،۵۷
(ڈاکٹر) میک ٹیگرٹ	۶۹،۵۷	میر تقی میر	۱۱۸
(مولانا) محمد علی جوہر	۶۴	مسعود سعد سلمان	۶۹
مہدی سوڈانی	۹۲،۶۹	(شیخ) محی الدین ابنِ عربی	۷۲
مسولینی (اطالوی حکمراں)	۱۲۵،۷۴	(سید) محمد عقیل رضوی	۱۱۴

مولانا روم (جلال الدین رومی) ۵۸، ۷۱، ۷۵، ۷۶، ۱۴۳، ۱۵۰

(ن-و-ہ-ی)

نذیر فتحپوری	۴، ۱۱، ۱۲، ۲۰، ۲۲	نکلسن (مشہور مستشرق)	۵۷، ۶۹، ۷۰
نانک (گرونانک)	۵۸، ۱۰۲، ۱۲۵، ۱۳۳	نیٹشے (جرمنی کا مشہور فلسفی)	۵۸
وصی احمد صدیقی	۹	ورقہ بن نوفل	۲۸، ۲۹، ۳۲
(پروفیسر) وھائٹ ہیڈ	۵۷	ہٹلر	۱۲۵،۴۷
ہیرالڈ لیمب	۵۸	ہیگل	۱۴۳،۶۹
(حضرت) یوسفؑ	۹۶،۳۵	یاسر عرفات	۴۴

مقامات:

(الف)

انگلستان	۷، ۵۷، ۶۰، ۶۷، ۹۲، ۱۱۷	امریکہ	۱۳، ۲۳، ۲۴، ۴۴، ۶۹، ۹۹، ۱۱۷
افغانستان	۲۳، ۲۵، ۷۰، ۷۳، ۹۳، ۱۱۷	اسلام آباد	۲۶
ایران	۵۵، ۷۰، ۹۹، ۱۱۷	اشبیلیہ	۹۳
اندلس	۹۵، ۹۶، ۱۴۲	ایودھیا	۱۱۱

(ب)

بھارت	۵، ۶۰، ۶۵، ۷۷، ۹۲، ۱۳۹	بلغاریہ	۶۳
بھوپال	۷۳	بابل	۹۹
بخارا	۱۳۹		

(پ)

پاکستان ۵،۲۵،۲۶،۱۰۸،۱۳۰،۱۳۱،۱۴۹ پونہ ۱۲،۱۸،۲۰،۲۲،۹۹،۱۵۰

پولینڈ ۶۳

(ت)

ترکستان ۴۴،۵۵ توران ۵۵ ترکمانستان ۷۰

(ج-چ-ح)

جموں ۱۰ جبل نور ۲۸

چین ۳۵،۱۳۹ حدیبیہ ۳۳،۱۵۰

حبشہ ۳۷ حجاز ۴۳،۴۶،۵۳،۶۳،۱۴۲

(ر-ز)

روس ۶۳،۷۰،۱۱۷،۱۳۹ زیکوسلواکیہ ۶۳

(س-ش)

سمرقند ۱۳۹ شام ۴

(ع-غ-ف)

عراق ۱۳،۲۳،۲۴،۲۵،۷۰ غارِ حرا ۲۸

فلسطین ۳۹،۴۰،۹۳ فرانس ۱۱۲،۱۱۷

(ل-م-ن-ہ)

لاہور ۱۷،۳۱، لندن ۴۷،۵۴،۶۲،۶۳

لکھنؤ ۱۱۱ مصر ۲۴،۳۵،۴۴،۷۸

مکہ مکرمہ ۲۸،۳۲، ۳۳،۳۴، ۳۶،۳۷،۴۲،۴۳،۶۵،۱۱۲

مدینہ منورہ ۳۲،۳۴،۳۶،۳۷،۴۳

میزورم ۳۹ مسوری ۱۳۴

ناگالینڈ ۳۹ ہندوستان ۲۶،۳۱،۳۵،۶۱،۷۰،۱۰۶،

۱۱۳،۱۱۴،۱۱۷،۱۱۸،۱۴۹

(ی)

یونان ۲۴ — یورپ ۳۸، ۳۹، ۴۱، ۴۴، ۶۰، ۶۳، ۶۹، ۹۰، ۹۴، ۱۰۰

یمن ۳۹، ۶۳

کتابیات (الف)

ارمغان حجاز ۱۵، ۶۸، ۷۳، ۱۲۸ — اسرار خودی ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۱

(ب-پ-ت)

بانگِ درا ۱۷، ۲۷، ۶۱، ۶۲، ۶۴، ۶۸، ۱۰۳، ۱۰۸، ۱۲۰، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵

بالِ جبریل ۴۳، ۵۰، ۵۸، ۶۸، ۷۳، ۱۰۲، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۹، ۱۳۳

پیامِ مشرق ۴، ۱۵، ۵۵، ۶۸، ۷۱، ۷۲، ۸۰، ۸۸، ۱۱۰

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق ۶۸، ۷۳

تعلیم شناسی ۸، ۹ — تشکیل الٰہیاتِ جدید ۶۷

(ج)

جاویدنامہ ۱۵، ۶۸، ۷۲ — جمال القراء ۳۲

(ر-ز)

رحمتِ عالمؐ ۲۲ — رموزِ بے خودی ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۱

رسالۃ الغفران ۷۳ — رامائن ۹۲، ۹۹، ۱۳۹

ریڈرس انسائیکلوپیڈیا ۱۰۰ — زبورِ عجم ۶۶، ۶۸، ۷۲

(س-ص-ض)

سیرتِ حلبیہ ۳۲ — صحیح بخاری ۲۹

ضربِ کلیم ۱۵، ۴۰، ۴۱، ۶۸، ۷۳، ۱۰۶، ۱۲۱، ۱۲۷

(ف-ق-گ)

فلسفۂ ایران ۶۷ — فتوحاتِ مکیہ ۷۳

قرآنِ کریم ۴۹، ۹۵، ۱۳۴، ۱۴۹، ۱۵۰ — گلشنِ راز ۷۲

ادارے، انجمنیں، تحریکیں

(الف)

اقوامِ متحدہ ۷، ۲۳ اخوان المسلمین ۴۴
انسٹی ٹیوٹ آف نیشنل انٹی گریشن، کالج آف ملٹری انجینئرنگ ۲۲، ۱۳۹

(پ-ت)

پین اسلامی ۷ تحریکِ پیامِ انسانیت ۱۹

(ج)

جمعیتِ اقوام ۷، ۳۹

(د)

دار العلوم ندوۃ العلماء ۶

(ر)

راجیو گاندھی کینسر اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دہلی ۱۰

(س)

سنٹر فار مارل ری آرمامینٹ (ایم آر اے) ۱۴۵

(ع)

عالمی رابطۂ ادبِ اسلامی ۶، ۲۲ عالمی گاؤں ۷

(ل)

لال بہادر شاستری اکیڈمی آف ڈولپمنٹ ایڈمنسٹریشن ۱۳۴

(ی)

یونیسکو ۱۵۰

☆☆☆

BAL KA ADABI WA TAHZIBI WARSA

BY

ANEES CHISHTI

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

81-8223-285-6